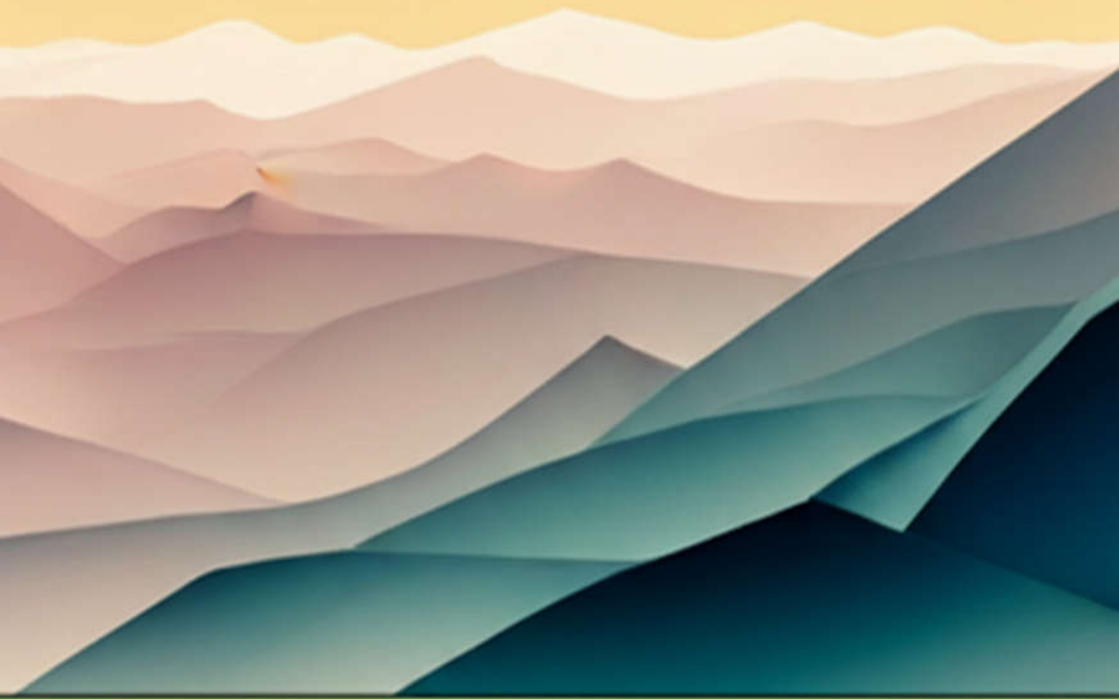
کشف

(افسانے)



محمد یوسف وسیر

کشف

(اردو افسانے)

محمد یوسف وسیر

شیرازی پبلیکیشنز، اردو بازار لاہور

مصنف: محمد یوسف وسیر

کمپوزنگ: آکاش

ناشر: مقصود شرق پوری

پبلشرز: شیرازی پبلیکیشنز، اردو بازار لاہور

باراول: ۲۰۲۴ء

قیمت: ۴۶۰ روپے

پیش لفظ

افسانہ ادب کی ایک نازک صنف ہے جس زندگی کی ایک جھلک نظر آتی ہے لیکن اس سے پوری تہذیب کی تہیں کھل جاتی ہیں۔ افسانہ کسی معاشرے میں موجود افراد کی نفسیات کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ یہ چند افسانے مشرق کا آئینہ ہیں جس میں مشرقیت اپنے آب و تاب سے نظر آئے گی۔

محمد یوسف وسیر

انتساب

ان کے نام جو حق دار ہیں کہ اپنے تمام متعلقات کو ان سے منسوب کیا جائے

عنوانات

عکس متحرک

میں محکمہ صحت کا ایک چھوٹا سا ملازم ہوں۔ دوسروں کی نظر میں میری شائد اتنی وقعت نہیں لیکن خود کو میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر سے کم نہیں سمجھتا۔ ادویات اور امراض کے نام مجھے ایسے یاد ہیں جیسے میں ہی نے دریافت اور ایجاد کیے ہوں، اس لیے میرا خیال تھا کہ انتظامیہ کے افراد میرے لیے احترام کا جذبہ رکھتے ہوں گے اور اسی خوش فہمی میں ایک بار میں نے اعلی افسر سے بدتمیزی کر ڈالی جس کی پاداش میں میرا تبادلہ دور دراز کے ایک گاؤں میں کر دیا گیا اور مجھے بوریا بستر باندھ کر گاؤں جانا پڑا۔

مجھے اس گاؤں میں جا کر کافی حیرانی ہوئی۔ جو تصور میں نے اک چھوٹے سے گاؤں کا اپنے ذہن میں قائم کیا ہوا تھا وہ یک سر ختم ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ گاؤں میں داخل ہوتے ہی گندے پانی کا ایک جوہڑ نظر آئے گا جس کے کنارے پر مویشی اور بچے کیچڑ میں لوٹ رہے ہوں گے، جوہڑ کے قریب گھروں کی کچی دیواروں پر چپٹے اوپلوں کی تہہ ہو گی۔ گاؤں کا مرکزی حصہ بلند ہو گا جہاں سے بدروئیں گلیوں کے درمیان سے اتر رہی ہوں گی۔

لیکن اس گاؤں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ ہموار قطعات پر بنے ہوئے پختہ اور نیم پختہ مکانات، کھلی اور صاف ستھری گلیاں اور بہت سے گھروں میں درخت اگے ہوئے تھے۔ گاؤں سے تقریبا دو ایکڑ کے فاصلے پر ایک تالاب تھا جس کے گرد پختہ اینٹوں کی تقریبا تین فٹ اونچی دیوار تھی۔ سارے گاؤں کی بدرووں کا پانی اس تالاب میں جمع ہوتا تھا۔ گاؤں کی مغربی جانب دو ایکڑ کے فاصلے پر دو کمروں اور ایک دفتر پر مشتمل محکمہ صحت کا مرکز تھا جہاں تین ملازم تھے۔ مرکز صحت سے تھوڑا آگے ایک پرائمری سکول تھا جس میں ایک استاد اور ایک درجہ چہارم کا ملازم تھا۔ سکول میں پچاس کے قریب طلبہ تھے جن میں تقریبا تیس لڑکے اور باقی لڑکیاں تھیں۔

گاؤں کے لوگ بہت شائستہ اور مہذب تھے۔ دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے، صاف ستھرا لباس پہنتے، پر وقار تھے اور رکھ رکھاؤ کو پسند کرتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان کی باقاعدہ تربیت ہوئی ہو یا ہو رہی ہو۔

یہیں میری ملاقات خلیق صاحب سے ہوئی جو کہ محکمہ زراعت کے ریٹائرڈ ملازم تھے۔ میں نے انہیں ہمیشہ سفید اور صاف ستھرے لباس میں دیکھا تھا۔ سر پر ہلکی سی پگڑی باندھتے، چھوٹی سی سفید داڑھی کے ساتھ نہایت پر وقار شخصیت کے مالک تھے۔ خلیق صاحب بہت کم گو اور تنہائی پسند تھے، لوگوں کے ساتھ بہت کم اٹھتے بیٹھتے۔

میرا مزاج بھی تقریباً ایسا ہی ہے کہ سماجی طور اطوار کو پسند کرتا ہوں اس لیے میرے ان کے ساتھ کافی مراسم پیدا ہو گئے اور میں اکثر ان کے گھر بھی آنے جانے لگا۔ ان کا گھر گاؤں کے مغربی حصے میں پہلی گلی میں واقع تھا۔ گھر تین کمروں پر مشتمل تھا جن کے آگے ایک صحن تھا اور ایک طرف بیٹھک تھی۔ مکان صاف ستھرا اور نیم پختہ تھا۔ گھر میں دو افراد رہتے تھے، ایک خلیق صاحب اور دوسری ان کی بیوی۔ ان کی بیوی کو میں بہن جی کہا کرتا تھا وہ بہت نرم دل نرم زبان تھیں اور اپنے شوہر کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ ایک کمرے میں ان کا سامان تھا دوسے کمرے کو وہ سونے والا کمرہ کہتے تھے اور تیسرا کمرہ ان کے اکلوتے بیٹے کا تھا جو یونی ورسٹی پڑھتا تھا۔

خلیق صاحب کے بقول ان کا بیٹا نہایت ذہین، مہذب، شائستہ اور محنتی تھا۔ اگر چہ اس سے میری ایک بھی ملاقات ممکن نہ ہوسکی لیکن میں اس کے عادات واطوار، رہن سہن اور انداز گفتگو تک کا شناسا ہو چکا تھا۔ وہ اس طرح کہ جب بھی خلیق صاحب سے ملاقات ہوتی وہ اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔ میں نے اس کا کمرہ بھی دیکھا تھا جس میں اس کے بچپن سے لے کر اب تک کی اشیا اور کھلونے محفوظ تھے۔ زمان خلیق صاحب کی اکلوتی اولاد تھی اس لیے انہوں نے اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی تھی۔

خلیق صاحب نے بتایا کہ زمان ابتدائی آٹھ دس تک کھلنڈرا سا بچہ تھا عام دوسرے بچوں کی طرح لیکن پھر اس میں تیزی سے پختگی آئی اور اس نے دوسرے بچوں کی نسبت جلدی سنجیدہ طبیعی اختیار کر لی۔ ویسے یہ بات اس کے کھلونے دیکھ کر بھی محسوس کی جا سکتی تھی وہ کتنا عقل مند سلجھا ہوا بچہ ہوگا۔ کیوں کہ اس کی اکثر اشیا ایسی حالت میں تھیں گویا ابھی خریدی ہوں۔ اس نے اپنی چیزیں تاریخی ترتیب سے سجا رکھی تھیں۔ اس کے کمرے میں ایک الماری تھی جس کے دروازے شیشے کے تھے۔ اس کے نچلے خانے میں کھلونے تھے۔ خلیق صاحب نے بتایا کہ وہ ہر سال ایک ہی کھلونا خریدتا ہے جب نئی کلاس کی کتابیں لینے جاتا ہے اور اس کھلونے کو پچھلے سال والے کھلونے کے ساتھ رکھ دیتا ہے۔ اس خانے میں

پندرہ سولہ اشیا تھیں، کچھ چیزیں یا تو ٹوٹ گئی ہوں گی یا پھر گم ہوگئی ہوں گی۔اوپر والے خانے میں اس کی کتابیں تھیں، کچھ نصابی اور کچھ غیر نصابی۔کتابیں بھی بہت اچھی حالت میں اور گرد و غبار سے پاک تھیں۔

خلیق صاحب نے بتایا کہ زمان عام طور پر پندرہ دن بعد آتا ہے اور کبھی امتحانات وغیرہ ہوں تو مہینہ بھی لگ جاتا ہے۔وہ آکر اپنی تمام اشیا کی صفائی کرتا ہے۔اور اگر کبھی کس وجہ سے اسے آنے میں دیر ہو جائے تو وہ خود اس کی اشیا کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

یہاں آکر میرا مزاج کافی تبدیل ہوا تھا، پہلے اگرچہ میں نفاست پسند اور رکھ رکھاؤ کا خیال رکھنے والا تھا لیکن اتنا زیادہ ملن سار نہیں تھا۔یہاں کے لوگوں کے مزاج کی شائستگی اور ملن ساری نے مجھے بھی کافی حد تک سماجی طبیعت کا بنا دیا تھا۔

جوں جوں میرا ان لوگوں سے رابطہ بڑھتا گیا،ان کے مزاج کی خصوصیات مجھ پر عیاں ہوتی گئیں۔

لیکن ایک بات، یا تو میں نے یوں یہ محسوس کیا یا واقعی ایسا تھا، یہ کہ ان لوگوں میں ہلکا سا حسد کا جذبہ موجود تھا۔اور وہ بھی صرف زمان کے حوالے سے۔جوں ہی میں کسی سے زمان کی بات چھیڑتا لوگ موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کرتے یا پھر خاموش ہو جاتے۔زمان پہلا لڑکا تھا جو یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا،اور شاید یہ چیز لوگوں میں احساس محرومی اور حسد کا جذبہ پیدا کر دیتی تھی۔

زمان کے بارے میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے کئی بار خلیق صاحب سے اظہار بھی کیا کہ زمان سے ملاقات کرائیں،لیکن اتفاق سے جب میں چھٹی پر واپس شہر آتا تو واپسی پر پتا چلتا کہ زمان آیا تھا۔اور جب میں ہفتہ وار چھٹی نہ کرتا تو زمان بھی کسی وجہ سے گاؤں نہ آسکتا۔

خلیق صاحب کا معمول تھا کہ جب زمان نے آنا ہوتا تو وہ اسے لینے خود گاؤں سے باہر تک جاتے۔گاؤں میں پکی سڑک نہیں تھی،قریبی قصبے سے گاؤں تک تانگے میں آنا پڑتا تھا۔

زمان نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی سے حاصل کی تھی اور پھر قریبی قصبے میں مڈل سکول میں داخلہ لے لیا تھا۔گاؤں سے چند اور بچے بھی اس کے ساتھ وہیں داخل ہوئے تھے۔خلیق صاحب چھٹی کے وقت روزانہ تانگے کا انتظار قصبے کی طرف جانے والی پگ ڈنڈی پر کرتے تھے۔

پانچ سال قصبے کے سکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد زمان ایک اور ساتھی کے ہم راہ کالج میں داخل ہو گیا،اور ہاسٹل میں رہنے لگا۔آج کل زمان سات دن کے بعد واپس گاؤں آیا کرتا تھا۔اب بھی خلیق صاحب ہر جمعرات کو اسے لینے

قصبے کے راستے پر جایا کرتے۔

زمان کا وہ دوست جو اس کے ساتھ کالج داخل ہوا تھا کسی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکا لیکن زمان کالج کے بعد یونی ورسٹی چلا گیا۔ اب وہ کبھی پندرہ دن بعد اور کبھی مہینے بعد گاؤں آتا تھا۔

میں نے بہت کم ایسے باپ دیکھے ہیں جو خلیق صاحب کی طرح اظہار محبت کرتے ہیں اور اپنی اولاد کی صلاحیتوں کا اتنا ذکر کرتے ہیں۔ خلیق صاحب بتاتے تھے کہ زمان کو مطالعہ کا بہت شوق ہے، وہ ہر قسم کی غیر نصابی پڑھتا ہے۔ انہوں نے اس کی کافی کتابیں مجھے دکھائی تھیں۔

پیشے کے لحاظ سے میرا تعلق شعبہ طب سے ہے لیکن عقلی علوم میں دل چسپی رکھتا ہوں، میں اکثر اس قسم کی کتابیں پڑھتا رہتا ہوں اور اس موضوع پر گفتگو بھی پسند کرتا ہوں۔ شاید یہی پہلو بھی زمان سے ملاقات کے اشتیاق کو زیادہ کرتا تھا کیوں کہ زمان کو بھی ان علوم سے دل چسپی تھی۔ میں نے اس کے کمرے میں فلسفہ، نفسیات اور مابعدالطبیعیات کی موضوع پر مبنی کتابیں دیکھی تھیں۔ خلیق صاحب خود اس قسم کی کتابیں خریدتے اور ایک دفعہ پڑھ کر زمان کو دے دیتے۔

ایک دن گفتگو کے دوران خلیق صاحب نے سانپوں کا ذکر کیا۔ کہنے لگے کہ سانپوں کے جوڑے میں سے اگر ایک کو مار دیا جائے تو اس کا زوج، چاہے وہ پاس نہ بھی ہو، مارنے والے کو تلاش کر کے ڈسنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہ سانپ اس آدمی کو تلاش کیسے کرتا ہے تو انہوں بے بتایا کہ جب سانپ مرتا ہے تو آخری منظر اس کی آنکھوں میں جم جاتا ہے اور اس کا زوج وہ عکس دیکھ کر قاتل کو تلاش کر لیتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ انسان میں بھی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے، لیکن ذرا اور طریقے سے۔ انسان جس چیز کو دیکھتا ہے اس کی تصویر بھی اس کی ذہن میں جم جاتی ہے، اور تب تک موجود رہتی ہے جب تک وہ اس چیز کو دوبارہ نہ دیکھ لے۔

ایک دو دفعہ ایسا بھی ہوا کہ میں ارادتاً ہفتہ وار چھٹی پر شہر نہ گیا تاکہ زمان سے ملاقات ہو جائے لیکن وہ ان دنوں بھی کسی وجہ سے گاؤں نہ آسکا۔ اب میں قدرے جھنجھلا سا گیا تھا، اور میں نے ارادہ کرلیا کہ چاہے مجھے پورا سال کیوں نہ رہنا پڑے میں چھٹی پر نہیں جاؤں گا اور زمان سے مل کر رہوں گا۔ اب میرا تجسس چڑچڑاہٹ میں تبدیل ہونا شروع ہو گیا تھا اور شاید ہلکا پھلکا حسد بھی پیدا ہو رہا تھا۔ ایک دن ہمارے مرکز کے انچارج نے بتایا کہ میری تبادلے کی درخواست منظور ہو گئی ہے اور چند دن تک باضابطہ طور پر مجھے احکامات مل جائیں گے۔ اسی دن خلیق صاحب نے بھی مژدہ سنایا کہ اس جمعرات کو زمان نے آنا ہے اور یقیناً اس سے میری ملاقات ہو جائے گی۔ انہیں میرے تجسس کا علم تھا اور اس بات کا

بھی علم ہو چکا تھا کہ اب میں یہاں چند دن کا مہمان ہوں۔

جمعرات کو میں بھی اس راستے کی طرف چلا گیا جو گاؤں کو قصبے سے ملاتا تھا۔ خلیق صاحب حسب معمول پہلے ہی اس طرف گئے ہوئے تھے۔ میں قصداً ان کی نظروں سے بچتا رہا اور ان سے کافی فاصلے پر ان کا پیچھا کرتا رہا۔ خلیق صاحب ویسے تو ہر وقت صاف ستھرے لباس میں ملبوس رہتے تھے لیکن جب زمان کو لینے جاتے تب خاص طور اہتمام کرتے۔

وہ پگ ڈنڈی پر تقریباً ایک میل تک چلے گئے تھے، وہاں رک کر کافی دیر تک راستے کی طرف نظریں لگائے انتظار کرتے رہے اور واپسی کے لیے گاؤں کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ میں جلدی سے مڑا اور ان کی نظروں میں آئے بغیر گاؤں واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد خلیق صاحب بھی گاؤں پہنچ گئے۔ میں نے زمان کا پوچھا تو میری طرف عجیب سی شرمندگی سے بھری ہوئی نظروں دیکھا اور خاموشی سے گھر کی طرف چلے گئے۔

مجھے بہت غصہ آیا لیکن میں کچھ کہے بغیر اپنے مرکز کی چل دیا۔ ہمارا چوکیدار مرکز سے باہر پودوں کو پانی دے رہا تھا، مجھے قدرے برہم دیکھ کر پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ میں کہا خلیق صاحب کی زبانی ان کے بیٹے زمان کی باتیں اور تعریفیں سن سن کر اکتا گیا ہوں، ملاقات کا کہتا ہوں تو۔۔۔۔۔

چوکی دار نے کہا، "خلیق صاحب بہت اچھے آدمی ہیں، بہت شفیق اور محبت کرنے والے انسان ہیں، سارا گاؤں ان کی عزت کرتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے، ان کا بیٹا زمان آج سے گیارہ سال پہلے ایک حادثے میں وفات پا گیا تھا، ایک گاڑی نے تانگے کو ٹکر ماردی تھی جس میں سکول کے بچے آ رہے تھے، تین بچے زخمی ہوئے تھے اور زمان نے موقعے پر ہی دم توڑ دیا تھا۔

کشف

میں خود ہی یہاں، یعنی ایسی ہی کسی مقدس جگہ پر، آنا چاہتا تھا۔ آپ یہ بالکل نہ سمجھیں کہ میں یہاں لایا گیا ہوں۔ میں عرصے سے غور وفکر کے لیے کئی محفوظ مقام کی تلاش میں تھا۔ پھر چند احباب نے میری مدد کی اور مجھے اپنی معیت میں یہاں چھوڑ گئے۔

مجھے یہاں لائے جانے کا محرک یہ ہے کہ مجھ پر چند ایسے نکات منکشف ہو گئے تھے جو عوام کے ادارک سے بالاتر تھے، اور جب میں نے ان نکات کو برسر عام واضح کرنے کی کوشش کی تو عوام کے نارسا اذہان ان کے متحمل نہ ہو سکے۔ میں آپ کے سامنے ان میں سے چند ایک کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

تجسس تلاش کی اساس ہے اور تلاش حرکت کا محرک۔ وجود کا ہر ذرہ تجسس کی بنا پر حرکت میں ہے۔ وجود خود کی تلاش ہے، اپنے آپ کو ڈھونڈ رہا ہے، اپنی حقیقت معلوم کرنے میں کوشاں ہے۔ وجود ایک کل ہے جو اجزا پر مشتمل ہے۔ ہر جز کل کا ایک عکاس ہے۔ اور اسی راستے پر گامزن ہے جس پر کل رواں دواں ہے۔ میں بھی اسی کل کا ایک حصہ ہوں اسی کلی تجسس کا عکاس ہوں اور اپنی حقیقت جاننے کا خواہاں ہوں۔ میرا خیال بلکہ یقین ہے کہ میں ایک نہیں کئی ہوں۔ اور ان کئی میں سے کوئی نہ کوئی تو میرا مستقل وجود ہونا چاہیے۔ میری پہچان بطور ایک مستقل وجود کے ہونی چاہیے۔ شائد ابھی آپ میری باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی ہوگی۔ لیکن میں ابھی آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ جب آپ میری داستان سنیں گے تو یقیناً مسئلے کو حل کرنے میں میری مدد کریں گے۔

میرا وجود یقیناً وقت کی تخلیق سے پہلے کا ہے۔ میں نے کون کون سے روپ بدلے اور میرا وجود تخلیق کے ایک دور سے دوسرے دور میں کیسے منتقل ہوتا رہا، مجھے اب ٹھیک سے یاد نہیں۔ میں وہاں سے شروع کرتا ہوں جہاں سے میری

یاداشت ٹھیک ٹھیک معلومات بتانے میں میری مدد کرے گی۔اور ہاں ۔۔۔میں اس وقت جس روپ میں ہوں میری زبان اور یاداشت اسی کے مطابق ہوگی اور چوں کہ تم بھی فی الوقت یہی روپ دھارے ہوئے ہو، یقیناً سمجھ جاؤ گے۔

میں وہاں سے شروع کرتا ہوں جہاں ایک بلند اور خوف ناک دھاڑ نے میرے شعور بیدار کیے۔میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے ارد گرد کا جائزہ لینا شروع کیا۔میں ایک ٹیلے کے پاس گھنی جھاڑی میں چھپ کر لیٹا ہوا تھا۔میری سامنے میلوں تک گھاس کے میدان تھے۔دائیں طرف قدرے دلدلی زمین تھی اور پیچھے بلند و بالا درختوں سے بھرا گھنا جنگل تھا۔میں جنگل میں کم ہی جایا کرتا تھا کیوں کہ گھنی جھاڑیوں اور زمین کو چھوتی ہوئی شاخوں میں میرے میری لمبے اور شاخ دار سینگوں کے الجھ جانے کا خدشہ تھا۔دلدلی علاقے میں میرا اکثر آنا جانا رہتا تھا کیوں کہ اس علاقے میں خطرات کم تھے۔ایک تو میرا وزن کم تھا اور مجھے تیرنا بھی آتا تھا، دوسرا اس علاقے شکاری انواع کا آنا جانا نہ ہونے کے برابر تھا۔گھاس کے میدان مجھے بہت پسند تھے لیکن اس موت کا راج تھا۔جا بجا، مختلف روپ دھارے، موت منڈلاتی رہتی تھی۔ظاہر ہے جہاں فوائد زیادہ ہوں گے وہاں خطرات بھی تو ہوں گے نا۔جہاں کھانے کو کچھ نہیں ہوتا وہاں موت بھی جانا پسند نہیں کرتی۔میں گھاس کے میدانوں کی طرف کم ہی جایا کرتا تھا۔گھاس اصل میں موت کا پھندا تھی۔وہاں موت کے جال ٹھنڈے میٹھے پانی اور ہرے ہرے گھاس کی صورت بکھرے ہوئے تھے۔موت ان نعمتوں کے ذریعے اپنے شکار کو لبھاتی تھی اور پھر جو بھی ان چیزوں کی طرف راغب ہو کر وہاں پہنچتا موت اسے جکڑ لیتی۔میں عقل پسند تھا، عقل کی مانتا تھا، عقل کو ہی اپنا محافظ سمجھتا تھا۔عقل مجھے سمجھایا کرتی تھی کہ رزق کی تلاش میں موت کو گلے لگانا حماقت ہے۔عقل مجھے قناعت کا درس دیتی رہتی اور مجھے گوشہ نشینی کی طرف مائل کرتی رہتی۔میں زیادہ تر ٹیلے پر گھنی جھاڑیوں کی اوٹ سے ان بدقسمت ساتھیوں کی حماقت پر کڑھتا رہتا جو خطرات سے بے پروا ہو کر گھاس کے میدانوں کی طرف جاتے اور موت کے کسی روپ کے ہتھے چڑھ جاتے۔دھاڑ کی خوف ناک آواز سے میری آنکھ کھلی۔موت شیر کے روپ میں ٹیلے کے قریب ہی کہیں پہنچ چکی تھی۔شیر مجھے ابھی نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس کا وجود بادلوں کے سائے کی طرح ٹیلے پر چھایا ہوا تھا۔شیر نے بھی ابھی مجھے نہیں دیکھا تھا۔وہ مجھے محسوس کر رہا تھا اور میں اسے محسوس کر رہا تھا۔اس کی دھاڑ نے میرے رگ و پے میں خوف بھر دیا تھا۔خوف لہروں کی صورت میرے وجود سے نکل رہا تھا اور چاروں طرف پھیل رہا تھا۔اسی خوف نے شیر کو میری موجودگی کا احساس دلا دیا۔میرے خوف کی لہروں نے شیر کو راستہ دکھایا اور اب وہ دبے پاؤں میری طرف بڑھ رہا تھا۔آخر کار میں نے اسے دیکھ لیا۔وہ سیدھا اسی جھاڑی کی طرف ہی آرہا تھا جس میں

میں چھپا ہوا تھا۔ میں جھاڑی کی اوٹ میں منجمد دبکا ہوا تھا۔ میرے جسم سے خارج ہونے والی خوف کی بو شیر کی راہ نمائی کر رہی تھی۔ میں خود اپنی موت کو اپنی طرف بلا رہا تھا۔ شیر مسلسل دبے پاؤں میری طرف بڑھ رہا تھا۔ موت کا مہیب سایہ پھیلتا جا رہا تھا، گہرا ہوتا جا رہا تھا، آگے بڑھ رہا تھا۔۔۔۔۔ کہ اچانک میری جبلت جاگی۔ زندگی کو قائم رکھنے کی جبلت۔ خطرے سے بچاؤ کی جبلت۔ اپنی حفاظت کی جبلت، جس نے میرے وجود میں بجلی بھر دی۔ شائد یہ خوف کا آخری درجہ تھا جہاں خوف طاقت، ہمت اور جرات میں تبدیل ہو جایا کرتا ہے۔ اس تبدیلی کو شیر نے بھی محسوس کر لیا۔ وہ اچانک رک گیا اور خود کو دوڑنے اور جست لگانے کے لیے تیار کرنے لگا۔ میں دور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میری ساری قوت میری دبلی پتلی ٹانگوں میں جمع ہونے لگی۔ میری ٹانگیں قوت سے تن گئیں اور ہلکی ہلکی کانپنے لگیں۔ میرا سارا خوف طاقت اور ارادے میں تبدیل ہو گیا۔ پھر میں ہوا میں اچھلا اور اڑتا ہو شیر کے آگے جا گرا۔ اس کے بعد مجھے بس دوڑنا یاد ہے۔ میں بھاگ رہا تھا، کس سمت میں یہ یاد نہیں۔ موت میرے پیچھے تھی، شیر کے روپ میں۔ اب میری بقا صرف حرکت میں تھی۔ شیر بتدریج میرے قریب آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے اس کی بدبودار سانسوں کی آواز آ رہی تھی۔ اب شیر میرے قریب پہنچ چکا تھا، اتنا قریب کہ اس کا پنجہ میرے پہلو تک پہنچ گیا۔ میں پہلو کے بل گرا اور اپنی رفتار کے زور میں دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر دوبارہ بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن وقت ختم ہو چکا تھا۔ شیر مکمل طور پر مجھ پر چھا گیا۔ اس نے اپنے دانت میری گردن پر گاڑ دیے۔ میرا چہرہ آسمان کی طرف تھا اور میری آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اپنے جسم کو ہر قسم کے تناؤ سے آزاد کر لیا۔ رک کیوں گئے؟ میرے ساتھی نے حیرت سے مجھ سے پوچھا۔ میں مزید نہیں چل سکتا، میں نے جھلا کر جواب دیا۔ میری گردن میں پنجالی کی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ پنجالی اس لٹھ سے منسلک تھی جو کولھو کو گھماتی تھی۔ میری آنکھوں پر مخروطی پردے تھے تا کہ میں ارد گرد نہ دیکھ سکوں۔ اسی اثنا میں میں نے اپنی کمر پر شدید ضربیں محسوس کیں جو میرے اچانک رک جانے کی پاداش میں لگائی گئی تھیں۔ میں نے ضربوں کا کوئی اثر نہ لیا اور ڈھٹائی سے کھڑا رہا۔ میں کافی عرصے سے یہی کام کر رہا تھا، کھانا پینا اور کولھو کے گرد گھومتے رہنا۔ پہلے میرے ساتھ ایک بوڑھی گائے تھی نا کارہ سمجھ کر قصاب کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا تھا۔ میرے مالک کا خیال تھا کہ جو وجود جس مقصد کے لیے تخلیق کیا گیا ہو اگر وہ مقصد پورا کرنے کی کوشش نہ کرے تو اس وجود کو ناپید کر دینا چاہیے۔ اس گائے کے جانے کے بعد میرے ساتھ ایک جوان اور طاقت ور بیل جوتا جانے لگا۔ اس بیل کے نظریات سے میں اتفاق نہیں کرتا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹا تھا اور دنیا کے بہت سے حقائق سے ناواقف تھا۔ اس نے ابھی دنیا کا قریب سے مشاہدہ نہیں کیا

تھا۔

رک کیوں گئے؟ اس نے پوچھا۔ میں مزید نہیں چل سکتا، میں نے جھلا کر کہا۔ میں اکتا چکا ہوں اس سفر سے، چلتے رہنا اور کہیں بھی نہ پہنچنا۔ جہاں سے سفر شروع کیا وہیں کے وہیں۔ کیا مقصد ہے اس زندگی کا؟ کھانا پینا، کولھو کے گرد آنکھیں بند کر کے گھومتے رہنا اور پھر مر جانا۔ اس سفر کا کوئی مقصد ہونا چاہیے، کوئی منزل ہونی چاہیے، کوئی محرک ہونا چاہیے۔ بے مقصدیت تو شوق کو ختم کر دیتی ہے۔ اور شوق ختم ہو جائے تو زندگی زندگی نہیں رہتی۔ اور پھر ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے تاکہ ہم چلتے رہیں اور ہمیں پتا نہ چلے کہ کہاں تک پہنچے ہیں۔ یہی صورت حال آ کر کار مایوسی پیدا کرتی ہے اور مایوسی جان لیوا ہوتی ہے۔ میرے ساتھی پر اس تقریر کا کوئی اثر نہ ہوا اور نہ ہی میرے مالک پر۔ اس نے ایک دفعہ پھر میری پشت پر ڈنڈے برسائے اور اور چند گالیوں سے نوازا لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوا، جسمانی طور پر اور نہ ہی نظریاتی طور پر۔ میں کافی عرصے سے یہی رویہ اپنائے ہوئے تھا اور میرا مالک بھی میری طرف سے بددل ہو چکا تھا۔ اس کا رویہ بھی میری طرف سے بدل چکا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اب ناکارہ ہوتا جا رہا ہوں، اور اب میری جگہ کوئی اور آنا چاہیے۔

اس دن میری ضد پہلے کی بسبت کچھ زیادہ تھی اور مایوسی عروج پر۔ پھر شاید میرے مالک کو مجھ پر ترس آ گیا۔ اس نے میری آنکھوں سے پردہ ہٹایا اور مجھے بندھنوں سے آزاد کر دیا۔ مجھے میری مخصوص جگہ پر لا کر باندھ دیا گیا۔ میرے مالک کا رویہ یک دم بدل گیا۔ شاید اس نے میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ مجھے پانی پلایا گیا اور بھوسہ ملا کٹا ہوا چارہ ڈالا گیا۔

تھوڑی دیر بعد میرا مالک دو آدمیوں کے ہم راہ آیا اور ان لوگوں کے ساتھ میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ آدمی مجھے تنقیدی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور مرے مالک سے ہلکی پھلکی گفتگو بھی کرتے جا رہے تھے۔ آخر کار وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک آدمی نے کھونٹے سے میری رسی کھولی اور اپنے ساتھ لے جانے کے لیے رسی کھینچنے لگا۔ دوسرا شخص ایک پتلی سے چھڑی لے کر میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمارا قافلہ ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں بہت سارے انسان جمع تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر ان میں سے کئی لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں اس تعظیم پر قدرے خوش ہوا اور میری مایوسی کچھ کم ہو گئی۔

ان لوگوں میں سے ایک لمبا تڑنگا شخص اٹھ کر میرے پاس آیا اور میری پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس دوران میں رسی

میرے گلے سے نکال کر ایک طرف رکھ دی گئی اور مجھے جنوب کے رخ کھڑا کر دیا گیا۔ایک شخص نے میری دونوں ٹانگوں کو ملا کر ایک رسی سے باندھ دیا جس سے زمین پر میری گرفت قدرے کمزور ہوگئی اور میرا توازن بگڑنے لگا۔اس لمبے تڑنگے شخص نے میرا ایک سینگ پکڑ لیا اور دوسروں کو ہدایت کی کہ اگلی ٹانگوں کو ملا کر رسی باندھیں اور ایک آدمی اس کی دم پیٹ کے نیچے سے موڑ کر مغرب کی طرف کھڑا ہو جائے۔اس کی ہدایات پر عمل کرنے کے بعد ایک شخص جس نے کہ میری دن تھام رکھی تھی دم کو اپن طرف کھینچ کر مجھے مشرق کی طرف زور سے دھکا دیا۔ میں پہلو کے بل زمین پر گرا۔ لمبے تڑنگے آدمی نے ایک ہاتھ سے میرے سینگ کو جکڑ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے میرے گلے پر چھری چلا دی۔ میں نے سر کو جھٹکا دیا اور خون کے چھینٹے میری چونچ اور گردن پر گرے۔کبوتری کا سفید جسم میرے پنجوں میں ابھی تک پھڑ پھڑا رہا تھا۔میں نے اس کے گلے میں اپنی مڑی ہوئی نوکیلی چونچ پیوست کی اور گرم گرم خون کی لذت محسوس کرنے لگا۔کبوتری کی پھڑ پھڑاہٹ سست پڑ گئی تھی۔اس کے کٹے پھٹے گلے سے اب خون صرف رس رہا تھا۔کبوتری کے جسم میں آخری کپکپاہٹ پیدا ہوئی اور پھر ساکت ہوگئی۔میں اسے شدت سے جھنجھوڑ رنے لگا اور اس کے سینے کا گوشت نوچ نوچ کر کھانے لگا۔اس کا پیٹ پھٹ گیا تھا اور انتڑیاں نظر آنے لگی تھیں۔ میں نے اس کے سینے میں سے دل نکالا اور اپنی چونچ میں جکڑ لیا۔

میں نے انقلاب برپا کر دیا تھا۔مفعول سے فاعل ہوگیا تھا۔کم زور سے طاقت ور ہوگیا تھا۔مقتول سے قاتل بن گیا تھا۔بزدل سے بہادر بن گیا تھا۔پستی کو چھوڑ کر بلندی کو اپنا لیا تھا۔ میں کروٹ بدل کر نیچے سے اوپر آ گیا تھا۔ان تمام انقلابات کے لیے ایک لمحہ ہوتو درکار ہوتا ہے اور وہ لمحہ میں نے پا لیا تھا۔اس بلندی کا مزید لطف لینے کے لیے میں ہوا میں بلند ہوگیا۔ بلندی سے پستی کی طرف دیکھیں تو ہر چیز چھوٹی لگتی ہے۔اوپر سے نیچے دیکھنے سے ہر ذی روح کوتاہ قد نظر آ رہا تھا۔زندگی میرے پروں کے نیچے آ گئی تھی۔ میں زندگی پر چھا گیا تھا۔ میں وقت پر حاوی ہوگیا تھا۔یا پھر میں سمجھ رہا تھا کہ میں وقت پر سوار ہوگیا ہوں۔میں مطمئن تھا،خوش تھا،متکبر تھا،مغرور تھا۔مغرور کیوں نہ ہوتا؟ میں طاقت ور بھی تھا اور میرا پیٹ بھی بھرا ہوا تھا۔بھرے پیٹ والا طاقت ور مقتدر بننا چاہتا ہے۔میں بھی مقتدر بننا چاہتا تھا بلکہ خدا بننا چاہتا تھا۔اور کسی حد تک خود کو اس عہدے پر فائز سمجھ بھی رہا تھا۔

میرا پیٹ بھرا ہوا تھا میں پھر بھی شکار کرنا چاہتا تھا۔اب میں شوق کے تحت شکار کرنا چاہتا تھا۔میں خود کو پرکھنے کے لیے چیر پھاڑ کرنا چاہ رہا تھا۔میری نظریں زمین کی طرف تھیں،انکساری کی وجہ سے نہیں بل کہ کسی کم زور ذی روح کی تلاش

میں جو میری طاقت کی پرکھ کے لیے تجربے کا آلہ بن سکے۔

میری نظر ایک پرندے پر پڑی جو زمین پر ادھر ادھر پھدک رہا تھا۔ وہ بار بار اڑنے کی کوشش کرتا لیکن تھوڑی سے اڑان بھر کر پھر زمین پر گر پڑتا۔ وہ بار بار زمین کی طرف کھنچ رہا تھا شاید زمین کی محبت اسے پرواز سے روک رہی تھی یا کہ موت کی آہٹ اسے جکڑے ہوئے تھی، وہ موت جو اسے میرے توسط سے نصیب ہونے والی تھی۔

میں آہستہ آہستہ نیچے جانے لگا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ کیوں کہ میں دیکھ ہی رہا تھا کہ پرندہ اڑنے سے قاصر ہے۔ اگر وہ اڑتا بھی تو کہاں تک جاتا۔ میرے ایک پنجے کی زد سے نکل کر دوسرے پنجے کی پہنچ تک چلا جاتا۔ میں زمین کے قریب پہنچ کر پرندے پر جھپٹا اور اسے پنجے میں جکڑ کر اڑنا ہی چاہتا تھا کہ کسی چیز نے مجھے پرندے سمیت لپیٹ لیا۔ وہ جال تھا جس نے مجھے بے بس کر دیا۔

میں اتنی جلدی حواس باختہ ہونے والا نہیں تھا اس لیے فوراً ہی صورت حال کو بھانپ گیا اور خود کو مقابلے کے لیے تیار کر لیا۔ میرے گرتے ہی درخت کے نیچے سے چند افراد نمودار ہوئے جو بلندی سے نظر نہیں آ رہے تھے۔ یہ لوگ عقابوں کے شکاری تھے جو میرے جکڑے جانے سے خوش اور پرجوش نظر آ رہے تھے۔ وہ میرے ارد گرد کھڑے ہو گئے اور تیز آواز میں گفت گو کرنے لگے۔ ان کی گفت گو سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کافی دنوں سے میری گھات میں تھے اور میرے معمولات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ پختہ معمولات کی وجہ سے ہی انہوں نے مجھ پر غلبہ پا لیا تھا۔ یہ پختہ عادات اچھی بھی ہوں تو بری ہوتی ہیں۔

شکاری میرے قریب آئے، مجھے جال سے نکالا اور مضبوطی سے جکڑ لیا۔ بڑے شکاری کے ساتھ اس چھ سات سال کا بچہ بھی تھا جسے ساتھ لانے کا مقصد شاید یہ تھا کہ وہ بچپن ہی سے قتل و غارت کا عادی ہو جائے اور رحم دلی اس کے اندر گھٹ کر مر جائے اور وہ اجداد کی نمائندگی بہتر طریقے سے کر سکے۔ وہ بچہ خوشی سے بے قابو ہو کر جائزہ لینے کے لیے میرے قریب ہوا تو میں نے شکاری سے پنجہ چھڑا کر اس پر حملہ کر دیا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ ایک ناخن اس کی آنکھ پر لگا اور شکاری نے سمجھا کہ اس کی آنکھ ضائع ہو گئی ہے۔ شکاری غصے کی شدت سے بے قابو ہو گیا۔ اس نے مجھے نیچے رکھا اور قریب پڑا ہوا پتھر اٹھایا اور میرا سر کچلنے لگا۔ میرے سر کی ہڈیاں چیخ رہی تھیں اور درد کی ٹیسیں میرے پورے وجود پر چھا رہی تھیں۔ درد کی شدت نے میری آنکھیں کھول دیں۔ شاید رات کو زیادہ دیر جاگتا رہا تھا اور نیند کی کمی کی وجہ سے سر درد شروع ہو گیا ہو۔

صبح کاذب سے یہی کیفیت تھی۔ میں ایک دفعہ سر درد کی دوا بھی لی تھی لیکن افاقہ نہ ہوا۔ سر درد کے باوجود مجھے وقت پر جاگنا تھا اور کام کاج کے لیے باہر نکلنا تھا۔

میرا رزق خالق نے موت میں لکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنا رزق حاصل کرنے کے لیے اور دوسروں کو کھلانے کے لیے موت نافذ کرنا اپنایا ہوا تھا۔ بہت سوں کو کھلانے کے لیے، زندہ رکھنے کے لیے چند ایک کو مارنا ہوتا تھا۔ روزانہ دو ایک جانوں کو ختم کرنا ہوتا تھا۔ ذبح کرنا میرا پیشہ تھا۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ میرا دل سخت ہے۔ میرے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جان ور جلدی ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ ایک تو میں جسمانی طور پر مضبوط تھا اور دوسرا یہ ہمارا آبائی پیشہ تھا جو کئی نسلوں سے چلا آ رہا تھا۔ ہم اپنے علاقے کے معروف قصاب تھے اور پورے علاقے کو گوشت مہیا کرتے تھے۔

سورج طلوع ہونے کے بعد میرا بھائی اور بیٹا مجھے جگانے کے لیے آئے۔ اس دن کام قدرے زیادہ تھا ایک تو معمول کے مطابق اپنی دکان کے لیے گوشت تیار کرنا تھا اور دوسرا ایک بیل ذبح کر کے گوشت تیار کرنا تھا۔ وہ بیل ہمارے ایک عزیز نے ایک تیلی سے خریدا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کا عقیقہ کرنا تھا۔ تیلی اس بیل کو اپنے کولھو پر جوتتا تھا لیکن اب وہ بوڑھا ہو کر ناکارہ ہو چکا تھا۔ ہمارے اس عزیز نے کہ سستا مل رہا ہے فرض ہی ادا کر لیں۔ ان کاموں کے علاوہ میں نے ایک شادی میں شرکت کے لیے ساتھ والے گاؤں بھی جانا تھا۔

میں کاہلی سے اٹھا، حوائج سے فارغ ہو کر ناشتہ کیا اور دکان پر جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ طے یہ ہوا تھا کہ میں دوپہر تک دکان پر بیٹھوں گا پھر بیل کو ذبح کر کے شادی میں شرکت کے لیے چلا جاؤں گا جب کہ بھائی اور بیٹا اس بیل کو تیار کر لیں گے۔

دوپہر کے وقت میں بیل کو ذبح کرنے کے لیے اس احاطے میں پہنچ گیا۔

احاطے میں ایک طرف بیل بندھا ہوا تھا۔ میں بیل کے قریب گیا اور اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس دوران اس کے گلے سے رسی نکال ایک طرف رکھ دی اور بیل کو جنوب کی طرف منہ کر کے کھڑا کر دیا گیا۔ ایک شخص نے بیل کی دونوں ٹانگوں کو ملا کر ایک رسی سے باندھ دیا جس زمین پر بیل کی گرفت کم زور ہو گئی اور اس کا توازن بگڑنے لگا۔ میں اس کا ایک سینگ پکڑ لیا اور ایک شخص کو ہدائت کی کہ اگلی ٹانگوں کو ملا کر رسی باندھیں اور ایک آدمی اس کی دم پیٹ کے نیچے سے موڑ کر مغرب کی طرف کھڑا ہو جائے۔ میرے ہدایت پر عمل کرنے کے بعد ایک شخص جس نے کہ بیل کی دم تھام رکھی تھی دم کو اپنی طرف کھینچ کر اسے مشرق کی طرف دھکا دیا اور بیل زمین گر گیا۔ میں نے بیل کا ایک سینگ پکڑا

اور اس کے گلے پر چھری چلا دی۔

بیل ذبح کرنے کے بعد میں گھر چلا گیا اور شادی پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

سہ پہر کے وقت میں سائیکل نکالی اور ساتھ والے گاؤں کی طرف چل دیا۔ جس گاؤں میں شادی تھی وہ ہمارے گاؤں سے تقریباً چار میل دور تھا۔ شادی میرے بچپن کے دوست کی بیٹی کی تھی۔ جس لڑکے سے شادی ہونی تھی وہ اس دوست کا بھیجا تھا اور اسی گھر میں رہتا تھا۔ اس لیے انہوں نے تقریب کے سہ پہر کے بعد کا وقت رکھا تھا۔

ایک میل کا راستہ طے کرنے کے بعد تقریباً دو میل کا راستہ پکی سڑک کا تھا۔ جب میں کچے راستے سے پکی سڑک پر چڑھا تو دائیں جانب سے ایک ٹرک جس پر بڑے بڑے پتھر لدے ہوئے تھے عین اسی جگہ سے گذر رہا تھا۔ اس ٹرک کا ایک ٹائر دھماکے سے پھٹا اور اسے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ ٹرک کے ایک طرف والے لکڑی کے تختے کم زور ثابت ہوئے اور ٹوٹ گئے جس کے نتیجے میں دس بارہ بھاری بھرکم پتھر جن کا وزن دو دو تین تین من تھا مجھ پر گرے۔ ان پتھروں نے میرے جسم کو پیس ڈالا۔ میں نے جھرجھری لی اور جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جسم سے گرد اور مٹی کے ڈھیلے جو غار کی چھت سے گرے تھے جسم جھٹک دیے۔ میں دو دن سے اونگھ رہا تھا جب ایک دفعہ پیٹ بھر کر گوشت کھا لوں تو دو تین دن تک کچھ کھانے کی حاجت نہیں رہتی۔ اب بھوک چمک رہی تھی شکار کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں غار سے باہر نکلا اور جسم و روح کو شکار کرنے کے لیے تیار کرنے لگا۔ مجھے شکار تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی بلکہ شکار خود بخود میرے آگے آ جاتا تھا۔ جان ور میری دھاڑ سن کر میرے سامنے ٹپک پڑتے تھے۔ شاید موت انہیں کونوں کھدروں سے نکال کر میرے سامنے لا پٹختی۔

میں زور سے دھاڑا۔ میرے دھاڑ سن کر قریبی جھاڑی سے ایک ہرن اچھل کر میرے سامنے آ گرا۔ وہ گرتے ہی تڑپ کر اٹھا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ میری ساری طاقت میرے کم زور ٹانگوں میں آ گئی۔ میں شیر کے خوف سے بھاگ رہا تھا۔ یہاں پر میں گڑبڑا گیا۔ اس موقع پر میں تذبذب کا شکار ہو جاتا ہوں۔ میں آگے تھا یا پیچھے؟ میں شیر کی صورت میں ہرن کا پیچھا کر رہا تھا یا کہ ہرن کی صورت میں شیر کے آگے آگے جان بچانے کے بھاگ رہا تھا؟ میں ہی آگے تھا اور میں ہی پیچھے۔ کیا معاملہ تھا؟ میں ہی آگے تھا اور میں ہی پیچھے۔ میں ہی مارنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں ہی خود کو خود سے بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میں دو شخصوں میں بٹ گیا۔ بلکہ میں کئی جگہ پر بٹ رہا تھا۔ میں کہیں مر رہا تھا کہیں مار رہا تھا۔ کہیں آگے تھا کہیں پیچھے، کہیں فاعل تھا کہیں مفعول، کہیں قاتل تھا کہیں مقتول اور جو

قاتل تھا وہ پھر مقتول تھا۔اس موقع پر میرا چیخنا چلانا بنتا تھا نا؟ میرے لیے ضروری تھا کہ میں چیخوں۔اگر میں چیختا چلاتا نہیں تو میں پھٹ جاتا۔میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا۔پھر میں چیخنا شروع کر دیا۔جو کچھ ذہن میں آیا بولتا گیا اور چلاتا گیا۔موت میرے گرد گھیرا تنگ کر رہی تھی اور اس گھیرے کو توڑنے کا ایک ہی حل تھا کہ میں شور کر کے اس کو بھگاؤں۔ اور میں ایسا ہی کرتا رہوں گا جب بھی موت کی آہٹ سنائی دی اور جس شکل میں مجھے موت نظر آئی اسے بھگاؤں گا۔ اب مجھے چلانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے آپ نے گھبرانا نہیں پریشان نہیں تھوڑی دیر بعد موت بھاگ جائے گی اور میں چلانا بند کر دوں گا۔

تنزل

میری داستان سادہ اور عام فہم ہے۔ میرے اور آپ میں صرف یہ فرق ہے کہ میں نے جدوجہد کی ہے اور آپ ایسا نہیں کرتے یا پھر آپ میں ایسا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوگی۔ آپ میری کہانی سنیں اور خود فیصلہ کریں۔

جب مجھے اپنے وجود کا احساس ہوا تو اس وقت صرف میرا وجود تھا۔ فقط میں ہی میں تھا، میرا ہی وجود تھا باقی سب لا وجود تھے۔ کائنات موجود نہیں تھی، نہ ہی اس کا امکان، حتیٰ کہ جسم تک موجود نہ تھا۔ میں ہی خالق تھا اور میں ہی مخلوق، میں ہی صانع تھا میں ہی مصنوع، میں ہی ابتدا تھا، میں ہی مبتدا، میں ہی انتہا تھا، میں ہی منتہی۔ کہ اچانک۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ میرا مادی وجود بھی ہے۔ مجھے ادراک ہوا کہ میرا شریک پیدا کر دیا گیا ہے اور میری یکتائی ختم ہوگئی ہے۔ دوئی کا تصور پیدا ہو گیا اور میری حیثیت نصف رہ گئی۔ میں مکمل سے کم ہو کر نصف رہ گیا۔ یہاں میری مایوسی کی ابتدا ہوئی۔ جب میری مایوسی کی ابتدا ہوئی تو میں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا، ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا، آس پاس کی سن گن لینے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ یہاں مجھے دھچکا لگا۔۔۔۔

یہ سب کچھ میں کہہ رہا تھا یا میرا جسم؟ یعنی مجھے قید کر دیا گیا تھا؟ مجھے مادے میں قید کر دیا گیا تھا، میری تجسیم کر دی گئی تھی، مجھے متشکل کر دیا گیا تھا، اب میرا جسم ہی میرا وجود تھا، اس مقام پر یکتائی بھی تھی اور دوئی بھی، میں اور میرا مادی جسم بہ یک وقت ایک بھی تھے اور الگ الگ بھی۔ اب میرے پاس جسم کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ تنزل کی ایک صورت تھی۔ میں لطیف بے صورت غیر مادی وجود سے کثیف مادی وجود میں تبدیل ہو گیا۔ پھر میرے جسم نے باقاعدہ جنگ کا آغاز کیا۔ اسے اپنی پہچان بنانی تھی، اپنا وجود قائم رکھنا تھا جب کہ میں نے اپنا مرتبہ قائم رکھنا تھا۔ جسم نے فتح پانی شروع کر دی۔۔۔۔۔

اس کے پاس مددگار قوتیں تھیں، وہ ان قوتوں کی مدد سے مجھے تابع کرتا جا رہا تھا، اور میری حیثیت کم کرتا جا رہا تھا۔ اس

کے پاس قوت لامسہ تھی جو مجھے باور کراتی کہ وجود اور بھی ہیں جنہیں چھوا جا سکتا ہے۔ بصارت نے یقین دلایا کہ نہ صرف دوسروں کا وجود ہے بل کہ تمہارے جیسے لاتعداد موجود ہیں۔ سماعت نے نہ نظر آنے والی نہ چھوئی جانے والی اصوات کا وجود پیدا کر دیا۔ اور پھر جسم کے پاس عقل کا بہت بڑا سہارا تھا، جس کی بنیاد اگر چہ حواس پر ہی تھی مگر رسائی کوسوں دور تھی، جب کہ میرے پاس بس ایک ادراک تھا کہ میں موجود ہوں۔ میرا مرتبہ آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔ میری حیثیت بتدریجا گر رہی تھی۔ میں خان دان کا فرد بنا تو چھوٹا ہوگیا، معاشرے ایک حصہ بنا تو مزید چھوٹا

تاہم بطور انسان میں نے یہ احساس قائم رکھا کہ بطور فرد میں انسانیت کا ادنی حصہ سہی لیکن بطور انسان باقی تمام مخلوقات سے بالاتر ہوں۔ مگر افسوس کہ یہ احساس بھی ختم ہونے لگا جب عقل نے اپنا میدان عمل وسیع کر لیا۔ عقل نے مادی کائنات سے متعلق علم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اب عقل نے میرا موازنہ کائنات سے کیا تو میری حیثیت بالکل ختم ہو گئی۔ میرے اندر مایوسی نے گھر کرنا شروع کر دیا۔ مایوسی انتہا تک پہنچی تو اضطراب شروع ہوا۔ یہ اضطراب اور بے چینی ،احساس زیاں سے پیدا ہوئی۔ احساس زیاں تنزل سے پیدا ہوا اور تنزل معروضی علم کے سبب ہوا۔ یعنی علم ہی اضطراب کی اصل تھا۔ میں دن رات اسی کرب میں مبتلا رہنے لگا۔ بے چینی مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔ میں خزاں رسیدہ ورق کی طرح لرزتا رہتا۔ کم مائیگی کا احساس مجھے کھائے جا رہا تھا۔--------

لیکن میرے مادی وجود کو اس کرب کا احساس ابھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے معمولات میں سرمو فرق نہیں آیا تھا۔ معروضی طور پر میں یعنی میرا مادی وجود اپنی ڈگر پر رواں دواں تھا۔ سارا کرب، دکھ، احساس زیاں، بے چینی اور اضطراب موضوعی تھا۔ میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنا چاہتا تھا، اپنی حیثیت بحال کرنا چاہتا تھا، اپنے مرتبے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن کیسے؟ اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں معروض کو نظر انداز کر دوں۔ اپنی مادی حیثیت سے انکار کر دوں۔ مطلقا موضوعیت کو اپنا لوں۔ اسی میں کھویا رہوں۔-------- چناں چہ میں نے اس منصوبے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ معروض کو یک بارگی رد کرنا ممکن نہ تھا، اس لیے بتدریجا نظر انداز کرنے لگا۔ زیادہ وقت اپنے آپ میں دبکا رہنے لگا۔ اپنے مادی روپ کو بھی پس پشت ڈال دیا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ اس کا اثر میرے مادی وجود پر، میرے مجسم روپ پر، میری کثیف متشکل حیثیت پر نمایاں طور پر نظر آنے لگا۔ اس کی حالت دگرگوں رہنے لگی۔ اس کے مددگار قوی اور اس کا سب سے بڑا سہارا، عقل، اس کا ساتھ چھوڑنے لگی۔ پہلے وہ مجھ پر غالب تھا، اب میرا غلبہ رہنے لگا۔ میں اس کو آلہ کار

بنالیا۔ جب میں اس پر قہقہے لگاتا تو اسی کے منہ سے، معروض کی غیر حقیقی نوعیت کے دلائل بھی اس کی زبان سے دیتا۔ میری حرکات وسکنات، چہرے کے تاثرات، گفتگو۔۔۔سب میں تبدیلی آنا شروع ہو چکی تھی۔ بڑاپن اور انفرادیت میرے مادی وجود میں بھی پیدا ہو رہی تھی۔۔۔۔۔

اور اس تبدیلی کو میرے ارد گرد کے افراد محسوس کرنے لگے۔ میرا خیال ہے کہ انہیں بھی یہ احساس ہونے لگا تھا کہ میں اپنی حیثیت بحال کر رہا ہوں۔ وہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ گفتگو میں محتاط ہونے لگے۔ میرے زیادہ قریب ہونے سے احتراز برتنے لگے۔ شائد، بل کہ یقیناً وہ مجھے خود سے بلند مرتبت سمجھنے لگے تھے اور میری حیثیت کا احترام کرنے لگے تھے۔ اس قسم کا ردعمل میرے لیے حوصلہ افزا ثابت ہوا اور میں نے واپسی کا سفر جاری رکھا۔ میں مستقبل سے ماضی کی طرف سفر کر رہا تھا۔ جس راستے پر چل کر میرے وجود نے میری حیثیت گرائی تھی اسی راستے پر واپسی کا سفر کر کے میں اپنی حیثیت بحال کر رہا تھا۔ میں پہلے ہی کائنات کو سکیڑ کر حواس کی رسائی تک محدود کر چکا تھا اور مادے کی معروضی حیثیت کو رد کر چکا تھا۔ اب میں نے اپنے ہم جنسوں کی حیثیت بھی گرانی شروع کر دی۔ میں نے یہ عقدہ حل کر لیا کہ حقیقت صرف اور صرف موضوعیت کا نام ہے۔ میں نے یقین کر لیا تھا کہ میں اپنے تمام ہم جنسوں سے منفرد ہوں تو پھر مجھے کسی معروضی دلیل کی ضرورت نہیں تھی۔ میں منفرد تھا، اور منفرد ہوں، مجھے یقین ہو گیا۔ میں سب سے بلند و بالاتر ہوں، میرے سامنے کسی کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ حقیقت تھی اور حقیقت ہے۔ اور اس حقیقت کو میں ہی نہیں میرے ہم جنس بھی محسوس کر رہے تھے۔ وہ میری اعلی حیثیت اور اپنی کم حیثیت کا ادراک کر کے مجھ سے دور دور رہنے لگے۔ وہ جرات ہی نہیں کرتے تھے کہ میرے قریب آئیں۔ میں جہاں جاتا دوسرے وہاں جانے سے احتراز کرنے لگے۔ میں جہاں بیٹھتا دوسرے وہاں سے اٹھ جانا مناسب سمجھنے لگے۔ میں دوسری کی طرف بڑھتا تو وہ پیچھے ہٹ جاتے۔ میرے سامنے وہ عقیدت سے سر جھکا لیتے اور سنجیدگی اختیار کر لیتے۔ لیکن میرے پیچھے، میں نے اکثر محسوس کیا تھا، میری شان و شوکت کی بحالی پر خوش ہوتے۔ خوشی سے مسکراتے، ہنستے بل کہ بعض اوقات قہقہے بھی لگاتے۔ یہ صورت حال مسرور کن تھی اور اسی سرور میں مست رہنے لگا۔

اب مجھے اپنی طاقت کا بھی احساس ہونے لگا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ میں سب کچھ کر سکتا ہوں، پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر سکتا ہوں، درختوں کو جڑ سے اکھاڑ سکتا ہوں، کسی کو مار سکتا ہوں، کسی کو زندہ کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اگرچہ یہ سب عوامل دوسروں کے احاطہ ادراک میں نہیں آسکتے تھے۔۔۔۔

میں نے لوگوں کے سامنے اپنی اس طاقت کے مظاہرے بھی کیے لیکن ان کے حواس ان ارتسامات کو وصول کرنے سے قاصر تھے۔لیکن مجھے اب اپنی حیثیت کا انکشاف کرنا تھا۔اب وقت آ گیا تھا۔اب میں چاہتا تھا کہ معروضی طور بھی میرے اس حیثیت کو تسلیم کرلیا جائے۔لوگ ذہنی طور پر تو تسلیم کر ہی چکے تھے اب صرف زبانی اقرار کی ضرورت تھی۔ میں نے اب برملا اظہار شروع کردیا کہ میری کیا حیثیت ہے اور میرے پاس کون کون سی طاقت ہے، میں کیا کیا کرسکتا ہوں۔میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ میرے نزدیک اس کائنات کی کیا حیثیت ہے، میں ہر چیز کا مالک ہوں، میں خالق ہوں، مختار ہوں، میرے سوا کسی شے کا کوئی وجود نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

لوگوں نے میری بات کو سمجھا، پرکھا، اور اس دنیا کو میرے قابل نہ سمجھتے ہوئے مجھے نہایت عقیدت اور احترام سے اس جگہ چھوڑ گئے

مردار

''صرف جاننا ضروری نہیں ہے، اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، برخوردار! اور عمل کے لیے قوت ارادی کے ساتھ ساتھ نیک نیتی بھی ضروری ہوتی ہے''۔
زاہد صاحب نے نرمی سے کہا۔
''اگر آپ کوئی کام کرنا ہی نہیں چاہتے تو اس کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آئے گی، اس کام میں آپ کو رکاوٹیں اور مشکلات ہی نظر آئیں گی۔ جوں ہی آپ نیت کر لیں تمام راستے کھل جائیں گے''۔
''بعض اوقات انسان مجبور بھی ہو جاتا ہے، وہ کچھ کرنا چاہتا ہے لیکن نہیں کر نہیں پاتا''
عبدالباقی نے کہا اور دوسروں کی طرف تائید طلب انداز میں دیکھا۔ عبدالباقی حال ہی میں عمرانیات کی تعلیم حاصل کر کے شہر سے لوٹا تھا اور گاؤں کے دوسرے مہذب نوجوانوں کی طرح زاہد صاحب کی پر مغز گفتگو سننے کے لیے آیا کرتا تھا۔ زاہد صاحب پچاس کے پیٹے میں تھے، نہایت خوش اخلاق، نرم خو اور متوکل شخصیت کے مالک تھے۔ سادگی اور قناعت ان کی شخصیت میں گندھی ہوئی تھی۔ سادہ، صاف ستھرا اور سفید لباس پہنتے جو وقت سے پہلے سفید بالوں پر خوب جچتا۔ انہوں نے حصول رزق کی دوڑ میں کبھی مقابلے کی کوشش نہ کی بلکہ اپنی ضروریات کو وسائل کے مطابق کم کر لیا تھا۔ انہوں نے کسی بھی ذریعہ معاش کو مستقلاً اختیار نہیں کیا۔ ان کی والدہ ان کے بچپن ہی میں اللہ میاں کے پاس چلی گئی تھیں، اور ممتا کے حقوق ان کی بڑی بہن کے سپرد کر گئی تھیں جو ان سے بارہ سال بڑی تھی۔ پھر اس کی شادی ہو گئی اور باپ نے کوشش کی کہ انہیں ماں کی کمی محسوس نہ ہو۔ ان کے والد بہت شفیق سادہ لوح اور خاموش طبع انسان تھے۔ ان کی تربیت نے اثر کیا اور زاہد صاحب میں بھی سادگی اور نرم خوئی جیسے فضائل پیدا ہو گئے۔ زاہد صاحب نے تعلیم حاصل کی اور منڈی میں ایک آڑھتی کے پاس بطور منشی کام کرنے لگے۔ باپ کی وفات اور اپنی شادی کے بعد گاؤں میں ایک

دوکان کھول لی۔اب وہ ایک کارخانے میں ملازم تھے۔اللہ نے انہیں پچھلی عمر میں ایک بیٹے سے نوازا جس کا نام شمیم احمد تھا جس کی عمر اس وقت آٹھ سال تھی۔وہ بہت ذہین تھا اور گاؤں کے پرائمری سکول میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔

زاہد صاحب کارخانے سے چھٹی کر کے آتے تو کچھ وقت گھر میں بیوی بچے کے پاس گذارنے کے بعد مرزا مجید کے ڈیرے میں آجاتے جس کے تین بیٹے بیرون ملک کام کرتے تھے اور وہ نہایت خوش حالی اور فارغ البالی کی زندگی گذار رہے تھے۔گاؤں کے وہ نوجوان بڑی عمر کے لوگوں میں بیٹھنا پسند کرتے تھے ان کے پاس آتے اور یہاں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے۔

اس دن عمل کے موضوع پر بات چھڑی ہوئی تھی۔زاہد صاحب کا موقف تھا کہ عمل کے لیے نیت ضروری ہوتی ہے۔ جب کہ عبدالباقی کا خیال تھا کہ بعض اوقات حالات بھی عمل کا محرک ہوتے ہیں۔اگلے دن چھٹی تھی اس لیے کافی دیر محفل جمی رہی۔پھر جب رات کافی بھیگ گئی تو محفل برخاست ہوئی اور تمام شرکا اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

زاہد صاحب کی اہلیہ، جس نے کہ شوہر کے نظریات کے مطابق زندگی کو ڈھال لیا تھا، آج قدرے برہم تھی۔اس کا خیال تھا کہ زاہد صاحب خانگی امور میں زیادہ ہی لاپروائی کا مظاہرہ کرنے لگے ہیں، بچے کو بہت کم وقت دیتے ہیں۔اس کی صحت قدرے گر رہی ہے۔بھوک بھی کم لگ رہی ہے۔زاہد صاحب نے تسلی دی کہ موسم کی شدت کی وجہ سے بھوک میں کمی ہو جاتے ہے اور کوئی وجہ نہیں۔لیکن بیوی کا خیال تھا کہ شمیم احمد کو شہر کے کسی بڑے ڈاکٹر سے چیک کروانا چاہیے۔ تھوڑی سی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ کل چھٹی ہے، شہر جائیں گے، دن کسی تفریحی مقام پر گذاریں گے اور شمیم احمد کو کسی اچھے سے ڈاکٹر کے پاس بھی لے جائیں گے۔

اس رات گاؤں میں دو واقعات رونما ہوئے۔شکور دین کے ہاں چوری کی واردات ہوگئی اور دوسرا نصیر بُجّھ کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔

نصیر شہر میں کباڑ کا کام کرتا تھا۔اس کے بارے افواہ تھی کہ چوری کا مال سستے داموں خریدتا ہے، تھوڑی سی تبدیلی کر کے آگے فروخت کر دیتا ہے۔اسی شک میں پولیس اسے پکڑ کر لے گئی تھی۔

زاہد صاحب شام سے کچھ پہلے شہر سے لوٹ آئے۔آج وہ قدرے تھکاوٹ محسوس کر رہے تھے۔ایک تو شہر آنے جانے کا سفر اور دوسرا شمیم نے انہیں گھمایا پھرایا بھی کافی تھا۔انہوں نے بیوی کو کچھ خریداری کی بھی اجازت دی تھی لیکن اس

بھلی مانس نے بے رغبتی ظاہر کی۔اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کی خواہشات کے سوتے خشک ہو چکے تھے اور دوسرا وہ شمیم احمد کی وجہ سے بھی پریشان تھی۔ڈاکٹر نے بچے کا معائنہ کر کے دوا تو دے دی تھا لیکن ساتھ چند ٹیسٹ بھی تجویز کیے تھے اور تاکید کی تھی کہ یہ ٹیسٹ جلد از جلد کروا کے اسے دکھائے جائیں۔

شام کی گفتگو کے لیے ان کے پاس تازہ رونما ہونے والے واقعات تھے۔تمام احباب اپنی اپنی آرا اور جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔مرزا صاحب نے کہا،

’’ہمارے معاشرتی نظام میں چند تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں جس کی وجہ سے جرائم بڑھ رہے ہیں‘‘۔

عبدالباقی کے مطابق انسان بعض اوقات حالات کے شکنجے میں اس طرح جکڑا جاتا ہے کہ اس کے پاس جرم کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا۔

زاہد صاحب نے کہا۔

’’مجرم جرم کرنا چاہتا ہے تو اسے اس قسم کے حالات نظر آنے لگتے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ اب اس کے پاس جرم کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔جرم سے بچنے کے لیے مضبوط قوت ارادی اور تیقن کی ضرورت ہوتی ہے۔پالنے والے پر یقین کامل اور حرام سے کراہت قوی ہو تو جرم کی طرف طبیعت مائل ہی نہیں ہوگی۔جو حرام کھاتا ہے وہ حرام سے کراہت نہیں کرتا۔ اسے اس چیز کے حرام ہونے کا یقین ہی نہیں ہوتا۔یاد رکھیں،اگر کسی کے پیٹ میں حرام کا ایک بھی لقمہ چلا جاتا ہے تو اس کے پورے نظام میں تبدیلی پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔اس کی سوچ،اس کی حرکات،اس کے خیالات تک بدلنا شروع ہو جاتے ہیں،حتیٰ کہ اس کے جسم ایک خاص قسم کی بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور یہی تعفن اسے مزید حرام خوری کی طرف مائل کرتا ہے اور وہ انسان بدعنوانی اور جرائم کی طرف جھکتا چلا جاتا ہے۔حرام کے لیے اس میں کراہت ختم ہوتی جاتی ہے اور اب حرام اسے حرام نہیں بل کہ حلال لگتا ہے۔‘‘

عبدالباقی قائل نظر نہیں آتا تھا۔

’’لیکن جناب مسئلہ تو پہلے لقمے کا ہے نا،دیکھنا یہ ہے وہ پہلا حرام لقمہ اس کے پیٹ میں گیا کیسے؟

کیا کوئی زبردستی اس کے منہ میں ٹھونس دیتا ہے؟

کیا اسے کھانے بعد علم ہوتا ہے کہ اس نے حرام کا لقمہ کھا لیا ہے؟‘‘

زاہد صاحب مسکرائے اور بولے۔

''وہ پہلا لقمہ ہی دراصل نیت کی خرابی اور تیقن کی کم زوری کی دلالت کرتا ہے''۔

زاہد صاحب اس موضوع پر بہت مضبوط دلائل دے سکتے تھے اور دینا بھی چاہتے تھے لیکن شمیم والدہ کا پیغام لے کر آیا کہ آج ذرا جلدی گھر آ جائیں۔ زاہد صاحب نے عین عروج پر محفل برخاست کرنے پر معذرت کی اور گھر چلے گئے۔

ان کی بیوی بیٹے کی وجہ سے پریشان تھی۔ ڈاکٹر نے کس قسم کے ٹیسٹ تجویز کیے تھے اور اسے کس قسم کا خدشہ تھا، یہ تو انہیں معلوم نہیں تھا لیکن وہ پریشان ضرور تھے۔ زاہد صاحب نے تسلی دی اور وعدہ کیا کہ جوں ہی کارخانے سے تنخواہ ملتی ہے وہ شمیم کے ٹیسٹ کروا کے ڈاکٹر صاحب کو دکھلاؤں گا۔

اگلے دن نصیر حوالات ہی سے بے گناہ ثابت ہو کر واپس آ گیا۔ شام کو یہی موضوع مرکزِ گفتگو رہا۔ مرزا مجید نے کہا۔

''کوئی بھی مجرم پیادہ ہوتا ہے جس کے پیچھے کسی فیل، کسی رخ یا کسی اسپ کا زور ہوتا ہے''۔

عبدالباقی کا اپنا موقف تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نصیر نے کسی نہ کسی مرحلے پر بے گناہ ثابت ہو کر رہا ہونا ہی تھا۔ پولیس کے سپاہی نے نصیر کو گرفتار کیا تھا، آپس معاملہ طے کیا اور کام ختم! اگر سپاہی ایمان داری دکھاتا اور اس کی گرفتاری بڑے افسر کی علم میں لاتا تو نصیر کو بڑے افسر سے معاملہ طے کرنا پڑتا۔ افسر ایمان داری پر قائم رہتے ہوئے معاملہ عدالت کے سپرد کرتا تو نصیر عدالت کے قد کے مطابق کوئی شخصیت تلاش کرتا اور عدالت سے معاملات طے کر لیتا۔ اتنے لمبے چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی سپاہی نے اچھا کیا کہ کچھ لے دے کے معاملہ پہلے ہی مرحلے پر ختم کر دیا''۔

زاہد صاحب نے نہایت دھیمے لہجے میں اپنی رائے کا اظہار شروع کیا۔

''دیکھو بیٹا! معاشرہ بذاتِ خود وجود نہیں رکھتا، افراد ہی مل کر معاشرہ بناتے ہیں، اگر کوئی خرابی معاشرے میں پیدا ہوتی ہے تو اس کا مطلب ہے افراد کی ذہنیت تبدیل ہو رہی ہے۔ آپ حالات کو جرائم کا محرک کہتے ہیں، حالات بھی تو خود افراد کے پیدا کردہ ہوتے ہیں! کوئی مافوق الفطرت یا مافوق البشر قوت تو اس تبدیلی کی علت نہیں ہوتی! بعض افراد فطری طور پر حرام کی طرف مائل ہوتے ہیں، عام طور پر یہ میلان دبا رہتا ہے، مگر جوں ہی موقعہ ملتا ہے ان کی فطرت مجبور کرتی ہے، اور اگر فرد مضبوط قوت ارادی کا مالک ہو، وہ نیت کر لے کہ رزق حلال ہی لیے کوشاں رہے گا تو کبھی بھی جرم کا ارتکاب نہ کرے۔''

چند دن بعد زاہد صاحب کو تنخواہ ملی تو وہ شمیم احمد کو ساتھ لے کر ٹیسٹ کروانے کے لیے شہر چلے گئے۔ ٹیسٹ ہو گئے اور

شام تک نتیجہ مل گیا۔ڈاکٹر صاحب اس دن شہر سے باہر گئے ہوئے تھے،تاہم ٹیسٹ کرنے والے نے دبے لفظوں میں کسی خطرناک بیماری کا ذکر کیا تھا۔زاہد صاحب واپس آ گئے اور سوچا کہ اگلے دن اکیلے ہی ڈاکٹر صاحب سے مل لیں گے۔انہوں نے بیوی سے ان خدشات کا ذکر نہ کیا جن کا اظہار ٹیسٹ کرنے والے نے کیا تھا۔

اس دن وہ مرزا صاحب کے ڈیرے پر بھی نہ جا سکے۔ایک تو شہر سے آتے آتے دیر ہوگئی دوسرا وہ کچھ پریشان بھی تھے۔اگلے دن صبح صبح مرزا صاحب بچے کی مزاج پرسی کے لیے آئے اور تھوڑی دیر بعد عبدالباقی بھی آن پہنچا۔انہوں نے مشورہ دیا کہ آج آپ کارخانے سے چھٹی کر لیں اور شہر جا کر ڈاکٹر کو رپورٹ دکھالائیں۔عبدالباقی نے بھی تائید کی اور کہا کہ وہ کارخانے جا کر مینجر کو صورت حال سے آگاہ کر دے گا۔

ڈاکٹر نے رپوٹیں دیکھیں اور کالا یرقان تشخیص کیا۔اور کہا کہ فورا علاج شروع کروائیں ورنہ بیماری قابو سے باہر ہو جائے گی۔ان کے پوچھنے پر ڈاکٹر نے اخراجات کا بیالیس ہزار کا تخمینہ لگایا۔گھر واپس آ کر بیوی سے بیماری تو چھپا لی لیکن یہ بتا دیا کہ کافی رقم کی ضرورت ہے بچے کے علاج کے لیے۔

شام کو مرزا صاحب کے ڈیرے پر عبدالباقی اور مرزا صاحب ہی موجود تھے۔عبدالباقی رزق حلال کے موضوع پر گفتگو کرنا چاہ رہا تھا لیکن زاہد صاحب خیالات مرتکز نہیں کر پا رہے تھے۔ان کے ذہن میں شمیم احمد، بیالیس ہزار، یرقان، ڈاکٹر، ٹیسٹ، بے قابو۔۔۔ قسم کے الفاظ گردش کر رہے تھے۔وہ جلد ہی گھر آ گئے۔شمیم احمد سو چکا تھا مگر اس کی والدہ جاگ رہی تھی۔زاہد صاحب نے بیوی کو تسلی دی اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کی۔وہ مسلسل سوچ رہے تھے کہ رقم کا انتظام کہاں سے ہوگا۔مرزا مجید سے ادھار لے لیں گے، کارخانے سے ایڈوانس بھی لیا جا سکتا ہے۔لیکن مرزا صاحب نے ابھی چند ہفتے پہلے زمین خریدی تھی اور کہہ رہے تھے کہ دو لاکھ کا مقروض ہو گیا ہوں، اب لڑکے رقم بھیجیں گے تو آہستہ آہستہ قرضہ اترے گا۔لہٰذا ان سے پوچھنا بے سود تھا۔کارخانے سے ایڈوانس کا البتہ سوچا جا سکتا تھا۔

اگلے دن مزدوروں اور کاری گروں کو مینیجر کی نگرانی میں کام کرنا تھا کیوں کہ فورمین کو اچانک نکال دیا گیا تھا۔ہوا یوں کہ فورمین نے تیار مال کے دو ڈبے چوری کر کے نصیر کے ہاتھ فروخت کر دیے تھے،لیکن بات پھیل گئی اور مالکان تک پہنچ گئی۔مینجر کا کام کافی بڑھ گیا تھا اور اسے دفتر میں بیٹھنے کا موقعہ بہت کم مل رہا تھا۔دوپہر کے وقت جوں ہی مینجر دفتر میں داخل ہوا زاہد صاحب بھی اس کے پاس پہنچ گئے۔مینیجر زاہد صاحب کی ایمان داری، خلوص اور دانش مندانہ گفتگو کی وجہ سے انہیں بہت احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔وہ اس وقت قدرے پریشان تھا، ایک تو زیادہ کام کی وجہ سے اور دوسرا

فورمین کی نوکری جانے کی وجہ سے۔ کہنے لگا۔

''دیکھیے زاہد صاحب، اس نے تھوڑی سی بے وقوفی سے نوکری بھی گنوائی اور عزت بھی، بے چارے کو پتہ نہیں کا مجبوری تھی۔انسان بعض اوقات کتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ بنی بنائی عزت کی بھی پروا نہیں کرتا''۔

مینجر کافی جذباتی ہو رہا تھا، اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''زاہد صاحب، انسان اکیلا نظر آتا ہے لیکن اسے بہت سی قوتیں کھینچ رہی ہوتی ہیں، فرد جال کی گانٹھ کی طرح ہوتا ہے جسے ہر طرف سے ڈوریاں اپنی اپنی جانب کھینچ رہی ہوتی ہیں۔ وہ فرد کسی طرف بھی نہیں جا سکتا، اگر وہ ڈوریاں ٹوٹ جائیں تو خود اس کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے۔''

''لیکن، مینجر صاحب''، زاہد صاحب نے افسردہ سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے کہا، ''جال کی مضبوط گانٹھ وہ ہوتی ہے جو تمام قوتوں کھنچاؤ کے باوجود اپنی جگہ قائم رہے۔ اسی طرح مضبوط انسان وہ ہوتا ہے جو ہر قسم کے حالات میں اپنے موقف پر قائم رہے، اپنے ذہن میں غلط خیالات کو جگہ نہ دے۔ آپ فورمین کی بات کرتے ہیں کہ اسے پتہ نہیں کیا مجبوری ہوگی، مجبوری کوئی بھی ہو، انسان مضبوط قوت ارادی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے، حلال حرام کی تمیز رکھے تو اسے حرام کھاتے ہوئے کراہت ضرور ہوگی۔''

''مینجر صاحب''، زاہد صاحب نے مدبرانہ انداز میں کہا، ''ہم حرام جانور کا گوشت کیوں نہیں کھاتے؟ حالاں کہ بہت ساری اقوام انہیں جانوروں کا گوشت رغبت سے کھاتی ہیں اور انہیں کراہت نہیں ہوتی، یہ اس لیے کہ ان کے نزدیک وہ گوشت حرام نہیں ہوتا، ہمیں حرام گوشت سے کراہت کیوں محسوس ہوتی ہے؟ کیوں کہ ہم اسے حرام سمجھتے ہیں اور ہمارا ذہن اسے قبول نہیں کرتا۔ اگر ناجائز کمائی کو بھی ہم اسی طرح حرام سمجھیں تو یقیناً اس سے بھی کراہت پیدا ہو جائے گی۔''

''زاہد صاحب''، مینجر نے قدرے ترشی سے کہا، ''اگر جان جا رہی ہو تو مردار بھی جائز ہو جاتا ہے۔''

''لیکن ہمارا فورمین مر تو نہیں رہا تھا نا''، زاہد صاحب نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''زاہد صاحب! موت فقط جسمانی ہی نہیں ہوتی''، مینجر نے تھکے تھکے لہجے میں کہا ''جسمانی موت تو موت کی چھوٹی اور کم خوف ناک صورت ہے''

وقت کم تھا، لہٰذا زاہد صاحب نے بہت محتاط الفاظ میں شمیم احمد کی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے ایڈوانس کی بات کی۔ مینجر

نے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا بتایا کہ اس ماہ اضافی مال تیار کرنے کی وجہ سے مزدوروں اور کاری گروں کی تنخواہیں بھی مشکل سے ہی پوری ہوں گی، اس لیے ایڈوانس کا ملنا بہت مشکل ہے۔

زاہد صاحب اپنے کمرے میں آ گئے، چہرے پر شدید پریشانی کے آثار عیاں ہو رہے تھے۔ ان ہونٹوں پر ہمیشہ رہنے والی مسکراہٹ غایب تھی اور مزاج میں بھی چڑچڑا پن محسوس کر رہے تھے۔

ان کے ذہن میں ڈاکٹر کے الفاظ گونج رہے تھے، بیالیس ہزار، بیماری، شمیم احمد، شمیم احمد۔۔۔۔۔۔۔ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر وہ دیکھ نہیں رہے تھے،

کان آواز وصول کر رہے تھے لیکن آوازیں ان کے ذہن تک نہیں پہنچ رہی تھیں، بیرونی دنیا سے ان کا رابطہ منقطع ہو چکا تھا، انہیں صرف شمیم احمد نظر آ رہا تھ، ہنستا کھیلتا، دوڑتا بھاگتا، پھر اچانک چارپائی پر لیٹا ہوا، نہایت کم زور آواز میں ابا کو پکارتا ہوا، ہسپتال کے وارڈ میں پڑا ہوا، ڈاکٹروں کے مضطب چہرے، نرسیں ادھر ادھر بھاگتی پھر رہی تھیں، شمیم احمد، بند آنکھیں، شمیم احمد۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ چونک کر معروضی دنیا میں واپس آ گئے۔

اس شام وہ ڈیرے پر نہ جا سکے، روزانہ آنے والے باقی افراد کافی دیر تک ان کا انتظار کرتے رہے، گھر سے بھی پتا کروایا گیا مگر وہ گھر پر بھی نہیں تھے۔

عبدالباقی دوسروں کی نسبت شدت سے ان کا منتظر تھا کیوں کہ وہ اعتراف کرنا چاہتا کہ ان کے نظریات درست تھے اور یہ کہ اگر انسان مضبوط قوت ارادی کا مالک ہو تو حالات اسے مجبور نہیں کر سکتے، مجرم کی نیت میں فتور پیدا ہوتا ہے تو وہ جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔

زاہد صاحب دروازے سے باہر نکلے اور مڑ کر پیچھے کر کہا، ''نصیر بھائی، مال تو لاکھ سے اوپر کا ہے لیکن آپ پچاس ہزار دے دیں، اب آپ سے کیا بھاؤ تاؤ کرنا۔''

نصیر نے مسکراتے ہوئے بڑے خلوص سے کہا۔

''زاہد صاحب! میں تو آپ کا خادم ہوں، جیسا آپ حکم کریں۔''

زاہد صاحب ہلکے پھلکے دل کے ساتھ گھر کی طرف چل دیے، لیکن وہ متلی سی محسوس کر رہے تھے گویا منہ میں کسی مرے ہوئے جانور کا گوشت چلا گیا ہو۔

یادوں کی تپش

محل کی دیواریں مرمر کی طرح چمک رہی تھیں، اور ان پر سونے کی کشیدہ کاری اس کی شان وشوکت میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ بڑے بڑے فانوس اپنی روشنی بکھیر رہے تھے، اور شفاف بلور کے شیشوں سے گزرتی روشنی پورے ہال میں خوابناک چمک پیدا کر رہی تھی۔ محل کی راہداریاں اتنی وسیع تھیں کہ ان میں گم ہو جانے کا گمان ہوتا، اور ان کے درمیان بچھے ریشمی قالینوں پر قدم رکھتے ہی انسان نرمی اور لطافت کے احساس میں کھو جاتا۔

بہت سے خادم ادھر ادھر مصروف تھے۔ کوئی سنہری ٹرے میں قہوہ لیے آ رہا تھا، تو کوئی بیش قیمت آبخورے میں خوشبودار مشروب پیش کر رہا تھا۔ عالیشان تخت پر بیٹھا آدمی، جو اس پورے جاہ وجلال کا مالک تھا، بے نیازی سے سب دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی طمانیت تھی، جیسے وہ دنیا کی ہر خواہش کو پا چکا ہو۔ اس کے لباس کا ایک ایک دھاگہ امارت کا اعلان کر رہا تھا۔ وہ ہلکے رنگ کا ریشمی جبہ پہنے تھا، جس پر زربفت کے کام کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں قیمتی انگوٹھیاں جڑی ہوئی تھیں، اور اس کی کلائی پر بندھی گھڑی اس کی دولت کی گواہی دے رہی تھی۔

اس کی بیوی بھی حسین وجمیل اور شاہانہ انداز کی حامل تھی۔ مخملی لباس میں لپٹی، ہیرے جواہرات سے سجی وہ ایک ملکہ کی طرح لگ رہی تھی۔ اس کی چال میں ایک دھیما غرور تھا، جو ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے کبھی محرومی کا منہ نہ دیکھا ہو۔ اس کے بچے بھی بیش قیمت لباس میں ملبوس تھے، ان کے چہرے معصومیت کے ساتھ ساتھ ایک عجیب تفاخر سے چمک رہے تھے۔ وہ ایسے کھیل رہے تھے جیسے یہ سب کچھ ہمیشہ کے لیے ان کا مقدر ہو، جیسے یہ شان وشوکت کبھی ختم نہ ہو سکے گی۔

محل کی کھڑکیوں سے باہر دیکھیں تو ایک خوبصورت باغ تھا، جہاں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایک طرف نیلا جھیل سا تالاب تھا، جس میں فوارے پانی اچھال رہے تھے۔ مور اپنی دم پھیلائے رقص کر رہے تھے، اور ہوا میں تیرتی

خوشبو فضا کو مزید دلکش بنا رہی تھی۔ ہر طرف سکون اور آسودگی کا راج تھا، جیسے زندگی نے اپنی ساری نعمتیں اس خاندان پر نچھاور کر دی ہوں۔

شہر میں ان کا بڑا رعب و دبدبہ تھا۔ لوگ ان کے محل کے قریب سے گزرتے وقت بھی آہستہ قدم رکھتے، جیسے کوئی مقدس مقام ہو۔ دروازے پر سونے کے دروازہ بان کھڑے رہتے، جو کسی کو بھی بغیر اجازت اندر جانے نہ دیتے۔ ہر محفل میں ان کا ذکر ہوتا، ان کی دولت اور شان و شوکت کی داستانیں زبان زدعام تھیں۔ بڑے بڑے تاجر اور رئیس ان کے در پر آ کر منتظر رہتے کہ کب انہیں ملاقات کا شرف بخشا جائے۔ دعوتوں میں ہر طرح کے نایاب کھانے چنے جاتے، ہر مجلس میں قیمتی مشروبات پیش کیے جاتے، اور ہر جشن میں ایسی آرائش کی جاتی کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔

زندگی اپنی انتہا پر تھی، کوئی پریشانی نہ تھی، کوئی غم نہ تھا۔ ہر خواہش ایک اشارے پر پوری ہو جاتی تھی۔ یہ ایک خوابناک حقیقت تھی، ایک ایسا محل جہاں صرف خوشحالی اور خوشبو کا راج تھا۔ مگر قسمت کے کھیل بھی عجیب ہوتے ہیں، جو لمحوں میں تخت کو تختے پر لے آتے ہیں۔ مگر اس محل کے باسی ان خدشات سے بے نیاز اپنی جنت میں مگن تھے، یہ جانے بغیر کہ وقت کے پاؤں میں کبھی زنجیر نہیں ہوتی۔۔۔

ایک دن محل کی فضا میں ایک عجیب سی تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ بیوی اور بچے دھیرے دھیرے اپنے ماضی کو یاد کرنے لگے۔ ابتدا میں یہ صرف گفتگو تک محدود تھا، پر آہستہ آہستہ ان کے ذہن میں پرانی یادوں کے نقوش نمایاں ہونے لگے۔

بیوی ایک دن کھڑکی کے قریب کھڑی تھی اور اچانک بولی، " کیا تمہیں یاد ہے وہ دن جب ہم کچے مکان میں رہتے تھے؟ وہ چھوٹا سا صحن، وہ ٹوٹی ہوئی کھاٹ...؟"

شوہر نے فوراً سختی سے کہا، " یہ کیا کہہ رہی ہو؟ ہم ماضی کو بھول چکے ہیں۔ ماضی کا ذکر کرنا ہمارے حال کو کمزور کر دے گا۔ یہ خوشحالی، یہ محل، یہ سب ہمارا موجودہ سچ ہے۔ ماضی کو یاد کرنا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔"

مگر بیوی نے ایک گہری سانس لی اور کہا، " لیکن وہ دن بھی تو حقیقت تھے، جن میں ہم نے بھوک برداشت کی، تپتی دھوپ میں زندگی گذارتے تھے، ان کا ذکر کرنے میں کیا نقصان؟"

بچے بھی ماں کی باتوں میں دلچسپی لینے لگے۔ " کیا واقعی ہمارے پاس اتنا کچھ نہیں تھا؟ ہم کیسے جیتے تھے؟ ہمیں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں ملتا تھا؟" وہ سوال پر سوال کرنے لگے۔

شوہر نے غصے میں آ کر کہا، " بس کرو! ماضی کو مت یاد کرو، یہ تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا! میں کہتا ہوں کہ یہ سوچ بھی

ہمارے حال پر اثر ڈال سکتی ہے۔یادوں کی تپش حال کو بھی پگھلا دیتی ہے۔"

مگر یادیں دبنے کے بجائے مزید ابھرنے لگیں۔ بیوی نے مزید باتیں شروع کر دیں، بچوں نے اور زیادہ سوالات کیے۔ان کے ذہنوں میں ماضی کی غربت اور تکلیف کے مناظر گونجنے لگے۔اور پھر، جو کبھی خواب تھا، وہ دھیرے دھیرے حقیقت میں بدلنے لگا۔

محل کی چمک ماند پڑنے لگی۔دیواروں پر نظر آنے والی سنہری کاریگری جیسے دھندلانے لگی ہو۔فانوسوں کی روشنی کمزور ہونے لگی، اور محل کے در و دیوار ایک عجیب سی ویرانی میں ڈھلنے لگے۔ریشمی قالین، جو کبھی نرم اور گداز تھے، اب دھیرے دھیرے سخت اور کھردرے ہونے لگے۔

بچے جو کبھی بیش قیمت لباس میں کھیلتے تھے،ان کے کپڑے جیسے پھٹنے لگے،ان کے چہرے کی وہ معصومانہ چمک جیسے مدھم ہونے لگی۔ملازمین، جو ہر وقت حاضر باش رہتے تھے، آہستہ آہستہ غائب ہونے لگے۔ پہلے چند نوکر کم ہوئے، پھر مزید،اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا محل جیسے سنسان ہونے لگا۔

شوہر نے گھبرا کر بیوی کی طرف دیکھا،"میں نے کہا تھا، ماضی کو مت یاد کرو! یہ سب تمہارے ماضی کے تذکرے کی وجہ سے ہو رہا ہے! تم نہیں سمجھتے کہ سوچ بھی حقیقت کو بدل سکتی ہے؟"

بیوی کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔"یہ سب کیسے ہو رہا ہے؟ کیا واقعی ماضی کو یاد کرنے سے حال بدل جاتا ہے؟"

لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، ماضی کی یادیں ان کے ذہنوں پر حاوی ہونے لگیں۔پہلے یہ صرف ایک خواب سا لگتا تھا، مگر آہستہ آہستہ حقیقت میں بدلنے لگا۔ ہر فرد بار بار اپنے ماضی کو یاد کرنے لگا،اور جیسے جیسے وہ یادیں تازہ ہوتیں،ان کے اردگرد کی دنیا بدلنے لگتی۔

باپ بار بار منع کرتا، کہ ماضی کی یادیں حال پر اثر ڈالتی ہیں۔وہ کہتا،"یہ یادیں صرف خیالات نہیں، یہ حقیقت کو بدل دیتی ہیں۔اگر تم نے مسلسل ماضی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا، تو یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں، ختم ہو جائے گی۔" مگر گھر کے باقی افراد اس کی بات کو نظر انداز کرتے رہے۔ وہ بار بار اور مسلسل منع کیے جار ہا تھا لیکن باقی افراد مسلسل یادوں کو کریدتے جا رہے تھے۔دیکھتے ہی دیکھتے ان کے خوبصورت لباس بوسیدہ ہونے لگے۔سنہری کشیدہ کاری والے لباس پھٹنے لگے، قیمتی زیورات غائب ہونے لگے۔آئینے میں چہرے دیکھے تو وہ پہلے جیسے چمکدار اور شفاف نہ رہے۔محل کی دیواروں میں دراڑیں پڑنے لگیں، فانوس کی روشنی مدھم ہونے لگی، اور باغ کے خوشبودار پھول

مرجھانے لگے۔فوارے بند ہو گئے،اور تالاب کا نیلا پانی کیچڑ میں بدلنے لگا۔

اس نے اب قدرے بلند آواز میں روکنا شروع کر دیا لیکن وہ رکتے ہی نہ تھے۔خادم ایک ایک کر کے غائب ہونے لگے۔ جہاں کبھی محفلیں سجی رہتی تھیں،اب سنسانی چھانے لگی۔ بچے جو ہنستے کھیلتے تھے،اب حیران اور خوفزدہ تھے لیکن مسلسل ماضی میں ڈوبتے جا رہے تھے۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب محل کی دیواریں مکمل طور پر مٹی میں بدل گئیں۔سنہری دروازے مٹی میں مل گئے،اور زمین پر صرف ایک خستہ حال جھونپڑی باقی رہ گئی۔عورت کا مخملی لباس میلی چادر میں بدل چکا تھا،بچے ننگے پاؤں کھڑے تھے۔

اب اس نے باقاعدہ چلانا شروع کر دیا،دہائی دینی شروع کر دی،خدا کے لیے رک جاؤ،اپنی زبانوں اور ذہنوں کو قابو میں رکھو،تم نے بہت کچھ تباہ کر دیا ہے،تم سب کچھ تباہ کر دو گے،خدا کے لیے مجھ پر اور خود پر رحم کرو،جو کچھ میں نے اتنی محنت اور ہمت سے بنایا ہے اسے پل بھر میں ختم نہ کرو،خاموش رہو! خاموش رہو!

لیکن دوسروں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا،لگتا تھا کہ وہ کسی سازش کے تحت ایسا کر رہے ہیں،اسے سازش کی بو آ رہی تھی، اس نے سب کو گالیاں دینا شروع کر دیں،کبھی وہ رونے لگتا کبھی گالیاں بکنے لگتا،لیکن ہر شے پگھلتی رہی اور آخر کار سب کچھ ختم ہو گیا۔

وہ کچی جھونپڑی میں بیٹھا تھا،اس کے ارد گرد بوسیدہ لباس والے گندے مندے بچے اچھل کود رہے تھے،اس کی بیوی جھونپڑی سے باہر گوبر کے ایندھن والے پتھر کے چولھے پر کچھ پکا رہی تھی۔

اس نے یہ سب دیکھا تو چکرا کر گر گیا۔بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے کانوں میں اس کے بچے کے الفاظ پڑے، ماں جی،ابے کو پھر دورہ پڑ گیا ہے،پانی لے کے آئیں۔

تعبیرِ خواہش

بوڑھا احمد خان ایک بوسیدہ چادر میں لپٹا ہوا، گلی کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں دور خلا میں گم تھیں، جیسے کسی کھوئی ہوئی دنیا کی تلاش میں ہوں۔ اس کے چہرے کی جھریاں، جیسے وقت کے ناخنوں نے اس کی جلد پر کہانیوں کے نقوش کھود رکھے ہوں، ہر شکن میں درد کی داستان چھپی تھی۔

زندگی نے اسے کبھی آسائش کا لمحہ عطا نہ کیا تھا۔ غربت کے دوزخ میں جلتے جلتے وہ کندن تو نہ بن سکا، مگر راکھ ضرور ہو گیا تھا۔ اس کی جوانی سخت مشقت میں گزر گئی۔ کھیتوں میں دن بھر پسینہ بہا کر، رات کو خالی پیٹ سونے کا عادی ہو چکا تھا۔ قسمت نے اُس پر کبھی رحم نہ کیا، اور جب کی، تو وہ بھی درد کا ایک اور پہلو تھا۔

احمد خان کی بیوی، زینب، ایک سنجیدہ مگر شفیق عورت تھی۔ وہ غربت کی چکی میں پستی رہی، مگر کبھی شکوہ نہ کیا۔ دو مرتبہ ماں بننے کی امید نے اُس کی آنکھوں میں روشنی بھری، مگر قسمت نے یہ چراغ بھی گل کر دیے۔ ایک بیٹا، جس کا نام اس نے ارسلان رکھا تھا، بمشکل دو سال کا ہوا تھا کہ بخار کی شدت نے اس کی ننھی جان کو نگل لیا۔ دوسرا بچہ، ایک بیٹی، دنیا میں آنے سے پہلے ہی مٹی کی گود میں چلی گئی۔ احمد خان نے ان دکھوں کو سہہ لیا، مگر زینب کی ممتا نہ سہہ سکی۔ وہ دن بدن کمزور ہوتی گئی، یہاں تک کہ ایک دن خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔

یہ سب احمد خان کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا، مگر وہ کسی پتھر کی طرح چپ چاپ یہ سب سہہ گیا۔ اس کا دل ٹوٹا ضرور تھا، مگر امید کی آخری کرن ابھی بجھی نہیں تھی۔ اُس کے سینے میں دولت حاصل کرنے کی خواہش اب بھی زندہ تھی۔ شاید یہ خواہش اس کے دکھوں کا مداوا بن سکتی تھی، شاید یہ دولت اس کی بقیہ زندگی میں کچھ راحت لا سکتی تھی۔ مگر یہ صرف ایک خواب تھا، سراب تھا، جسے وہ ہمیشہ چھونے کی کوشش کرتا رہا، مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔

اب وہ اکیلا تھا۔اس کی زندگی ایک بے رنگ تصویر بن چکی تھی۔ دن کے اجالے میں وہ گلیوں میں آوارہ پھرتا، کسی معمولی کام کی تلاش میں، اور رات کو ایک ٹوٹی چارپائی پر، کسی کھنڈر نما جھونپڑی میں سو جاتا۔اس کے سینے میں سانس کی تکلیف نے بسیرا کر لیا تھا۔ وہ زیادہ تیز چلنے سے قاصر تھا، مگر پھر بھی اپنی کمزوری کو نظرانداز کرتا۔غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر، وہ کسی مزدور کی طرح زندگی گزار رہا تھا، حالانکہ اب اس کی ہڈیوں میں وہ طاقت باقی نہ رہی تھی۔

ایک دن احمد خان حسبِ معمول نہر کے کنارے بیٹھا تھا کہ اچانک ہلچل مچ گئی۔ چیخ و پکار سن کر اس نے گردن گھمائی تو دیکھا کہ ایک بچہ تیزی سے بہتی نہر میں جا گرا ہے۔لوگوں کا ہجوم کنارے پر جمع تھا، مگر کوئی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔

احمد خان کے دل میں بے ساختہ ایک تڑپ اٹھی۔اس نے ایک لمحے کا بھی توقف نہ کیا اور نہر میں کود گیا۔پانی سرد تھا، اور اس کے جسم میں وہ طاقت نہ تھی جو جوانی میں ہوا کرتی تھی، مگر اس کی ہمت جوان تھی۔اس نے اپنی ساری توانائی جمع کی، بچے تک پہنچا، اور کسی طرح اس کی قمیص پکڑ لی۔تھوڑی دیر کی جدوجہد کے بعد وہ بچے کو کنارے پر لے آیا۔لوگوں نے فوراً بچے کو اٹھایا، اور کسی نے احمد خان کو سہارا دے کر باہر نکالا۔

یہ بچہ کوئی عام لڑکا نہیں تھا، بلکہ شہر کے ایک نامور رئیس کا بیٹا تھا۔رئیس فوراً موقع پر پہنچا، اور جب اس نے اپنے بچے کو صحیح سلامت پایا تو احمد خان کی طرف لپکا۔

"بابا! تم نے میرے بیٹے کو نئی زندگی دی ہے۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا"! رئیس نے آنسو بھری آنکھوں سے کہا۔

اگلے دن رئیس کے ڈیرے پر احمد بابا کے علاوہ بہت سے اور بھی موجود تھے۔احمد تمام لوگوں کی نگاہ کا مرکز تھا، آنکھوں کا تارہ تھا۔رئیس کے اکلوتے بیٹے کی جان بچنے پر جشن میں علاقے کے بہت سے بااثر لوگ بھی موجود تھے۔رئیس نے اس خوشی کے موقع پر جذباتی ہو کر اعلان کر دیا کہ بابا احمد کو اپنی زمین میں سے حصہ دے گا۔اور اسے اتنی زمین دے گا جتنی وہ صبح سے دوپہر تک پیدل چل کر گھیر لے گا۔

"احمد خان کا دل ایک لمحے کے لیے رک سا گیا۔زمین! وہی چیز جس کی حسرت میں اس نے زندگی گزاری تھی، وہی چیز جس کے خواب اس نے ہمیشہ دیکھے تھے۔اس کے ذہن میں ایک امید جاگی، ایک چنگاری روشن ہوئی۔

اگلے دن رئیس کے وسیع و عریض کھیت میں لوگ اکٹھے تھے۔احمد خان کے لیے میدان تیار تھا۔رئیس نے ہاتھ بلند کیا اور

اعلان کیا، " آدھے دن میں جتنا علاقہ تم دوڑ کر گھیر سکو گے، وہ تمہارا ہوگا۔لیکن شرط یہ ہے کہ تمہیں اسی نقطے پر واپس آنا ہوگا جہاں سے دوڑ شروع کی تھی۔"

احمد خان نے اثبات میں سر ہلایا، اور جیسے ہی اشارہ ملا، وہ زمین پر ننگے پاؤں دوڑ پڑا۔ پہلے اس کی رفتار متوازن تھی، لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اس کا لالچ بڑھتا گیا۔ وہ ایک بڑا دائرہ بنانا چاہتا تھا، زیادہ سے زیادہ زمین کا احاطہ کرنا چاہتا تھا۔

تماشائی حیران تھے۔ایک بوڑھا آدمی، جس کے جسم میں ہڈیوں کے سوا کچھ نہ تھا، اتنی تیزی سے دوڑ رہا تھا جیسے زمین کے ذرے اس کے پیروں کے نیچے ریت کی طرح بہہ رہے ہوں۔

"اور زیادہ... اور زیادہ"... اس کے دل میں ایک سرگوشی گونجی۔اس نے دائرہ اور بڑھا دیا، اس کی سانسیں تیز ہونے لگیں، سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا، مگر وہ نہ رکا۔

آخرکار جب دن کا نصف حصہ گزرنے لگا، تو اس نے واپسی کی راہ لی۔ مگر اب اس کے قدم بوجھل ہونے لگے، سانس اکھڑنے لگی، سینے میں جلن ہونے لگی۔لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ تکلیف میں ہے، مگر وہ رکا نہیں۔

زمین قریب آ رہی تھی، مگر اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔اس کا سر چکرانے لگا، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا، مگر وہ رکا نہیں۔آخری لمحے میں وہ زمین پر گرا، ہاتھوں سے مٹی کو کھینچنے کی کوشش کی، مگر پھر ایک آخری ہچکی لی اور خاموش ہو گیا۔

شکرِ خداوندی

شام کے دھندلکے میں پلیٹ فارم کی ٹھنڈی زمین پر بیٹھا وہ لڑکا، جو محض بارہ تیرہ برس کا ہوگا، ایک جوڑی جوتوں کو چمکانے میں محو تھا۔ اس کے ہاتھ کالے روغن سے سیاہ ہو چکے تھے، اور اس کی قمیص پر گردوغبار کے دھبے ایسے بکھرے تھے جیسے کوئی زخموں سے چور بدن ہو۔ ہر گزرنے والی ٹرین کی گرج میں اس کی نحیف آواز دب کر رہ جاتی، مگر وہ پھر بھی "پالش کروالو صاحب، بالکل نئی جیسی چمک آجائے گی" کی صدا لگاتا رہا۔

یہ لڑکا شہر کے ایک بوسیدہ علاقے کے ایک شکستہ مکان میں اپنی ماں اور دو معذور بہنوں کا واحد سہارا تھا۔ اس کے والد، جو ایک معمولی مزدور تھے، کچھ عرصہ قبل ایک حادثے میں چل بسے تھے، اور تب سے یہ نازک کندھے اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوجھ اٹھانے پر مجبور تھے۔

گھر کا دروازہ، جو کبھی لکڑی کا مضبوط در تھا، اب ادھڑ چکا تھا اور کسی بوڑھے کی کمزور ٹانگوں کی طرح لرزتا تھا۔ اندر جا کر نظر پڑتی تو کونے میں ایک بوسیدہ چارپائی پر اس کی ماں پڑی رہتی، جس کی آنکھوں میں وقت سے پہلے اُتر آنے والی نمی ہمیشہ بسی رہتی تھی۔ دونوں بہنیں، جو کسی بیماری کے باعث بچپن سے ہی معذور تھیں، ایک طرف بیٹھیں رہتیں، ایک دوسرے کی خاموش ہنسی میں اپنا دکھ چھپانے کی ناکام کوشش کرتیں۔

یہ لڑکا روزانہ سورج نکلنے سے پہلے گھر سے نکلتا، اسٹیشن کی سیڑھیاں اترتا، اور اپنے کام میں جُت جاتا۔ اس کے ہاتھوں میں وہ مہارت آچکی تھی کہ جوتے پر برش پھیرتے ہی وہ یوں چمک اٹھتا جیسے کوئی سویا ہوا خواب حقیقت بن گیا ہو۔ مگر اس کے اپنے خواب؟ وہ تو ایک عرصہ پہلے ہی غربت کی دراڑوں میں کہیں دفن ہو چکے تھے۔

ہر رات جب وہ گھر آتا، تو ماں کے نحیف ہاتھ اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے اور پوچھتیں: "بیٹا، آج کام کیسا

رہا؟" اور وہ چھوٹا سا مسکرا کر کہتا: "بہت اچھا امی، آج تو ایک صاحب نے کچھ زیادہ ہی پیسے دے دیے۔" لیکن اس کی جیب میں اکثر اتنے پیسے نہ ہوتے کہ وہ اپنی بہنوں کے لیے نئی چادریں خرید سکتا یا ماں کے لیے دوائی کا انتظام کر سکتا۔

زندگی یوں ہی دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ ہر دن ایک نیا امتحان، ہر رات ایک نیا سوال۔ مگر اس لڑکے کے ہونٹوں پر شکایت نہیں تھی، بس خاموشی تھی، جیسے کسی دریا کے کنارے پڑی ہوئی چٹان، جو ہر لمحہ پانی کی مار سہتی ہے، مگر اپنی جگہ اٹل رہتی ہے۔

ماں اکثر راتوں میں جاگ جاتی اور آسمان کی طرف دیکھ کر نجانے کیا دعائیں کرتی۔ شاید وہ اپنے بیٹے کی تقدیر میں کچھ روشنی کی دعا کرتی تھی۔ مگر قسمت کی سیاہی اس قدر گہری تھی کہ روشنی کی کوئی کرن اندر نہ پہنچ پاتی۔

پلیٹ فارم پر، جہاں امیر لوگ اپنے سوٹ کیس لیے جلدی میں بھاگتے تھے، وہ لڑکا ایک نظر ان پر ڈال کر پھر اپنے کام میں مگن ہو جاتا۔ نہ جانے کتنے چہرے اس کے سامنے آتے اور چلے جاتے، مگر ان میں سے کوئی بھی اس کی حالت نہ دیکھتا، کسی کی آنکھیں اس کے پیچھے کھڑے فاقہ زدہ خاندان تک نہ پہنچ پاتیں۔ وہ جوتے چمکاتا رہا، وہ زندگی کے اندھیرے راستوں میں روشنی کی ایک کرن ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ قسمت کی آندھی کسی دن اس کے کمزور چراغ کو ہمیشہ کے لیے بجھا دے گی۔

وہ رات شہر میں معمول سے زیادہ خاموش تھی۔ اسٹیشن کے قریب موجود پرانی عمارتیں اندھیرے میں کسی خوفناک سائے کی طرح کھڑی تھیں۔ اچانک زمین نے ایک لمحے کو لرزنا شروع کر دیا۔ دیواریں ہلنے لگیں، کھڑکیاں جھنکارنے لگیں، اور دور کہیں سے چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔

لڑکا پلیٹ فارم کے کنارے بیٹھا تھا جب زمین اس کے پیروں کے نیچے ہلنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، اسٹیشن کے قریب ایک پرانی، بوسیدہ عمارت زور سے لرزی اور دھڑام سے زمین بوس ہو گئی۔ گرد و غبار کے ایک گھنے بادل نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

جب دھول کا بادل ہلکا ہوا، تو زمین پر ایک چھوٹا سا سایہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ لڑکا تھا، جس کے نحیف جسم کو گری ہوئی اینٹوں اور پتھروں نے دبا دیا تھا۔ کسی نے شور مچایا، کوئی بھاگتا ہوا آیا، مگر تب تک اس کے نحیف وجود پر چوٹ لگ چکی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ میں شدید زخم آ چکا تھا، بازو بھی مفلوج سا ہو چکا تھا۔

اسے اسپتال لے جایا گیا، مگر وہاں وہی کہانی تھی جو ہمیشہ غربت کی تقدیر میں لکھی ہوتی ہے۔ "علاج مہنگا ہے،" ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے، بہنیں لرزتے ہونٹوں سے بھائی کو دیکھ رہی تھیں، اور وہ خود؟ وہ بس خاموش تھا، جیسے قسمت کے ایک اور وار کے لیے تیار ہو۔

وہ اب کام پر جانے کے قابل نہ تھا۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہ رہا۔ جو چھوٹی موٹی مدد کبھی مل جاتی تھی، وہ بھی بند ہو گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ فاقے طویل ہوتے گئے، اور اس چھوٹے سے مکان میں بھوک اور بے بسی کی تاریکی گہری ہوتی گئی۔

اسی دوران، شہر کے مرکز میں ایک عالیشان تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ شہر کے میئر نے اپنے بڑے سے بنگلے میں ایک عظیم الشان دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ روشنیوں سے جگمگاتے ہال میں معزز مہمان جمع تھے، رنگ برنگی میزوں پر ہر طرح کے کھانے چنے گئے تھے، اور ہر طرف قہقہوں کی گونج تھی۔

میئر نے مسکراتے ہوئے مائیک سنبھالا اور نہایت مطمئن لہجے میں کہا: "خدا کا شکر ہے کہ اس حالیہ زلزلے میں ہمارے شہر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ یہ واقعی ایک بڑی نعمت ہے"! اور مجمع نے تالیاں بجائیں۔

مگر اس تقریب سے میلوں دور، ایک بوسیدہ گھر میں تین بھوکی آنکھیں اندھیرے میں کسی معجزے کی منتظر تھیں۔ ان کے کانوں میں دور کہیں بجنے والی تالیاں جیسے تقدیر کا ایک اور طنزیہ قہقہہ بن کر گونج رہی تھیں۔

ملکۂ معظّمہ

درخت کے گھنے سائے تلے، ایک نازک قامت مگر بلند حوصلہ ملکہ کھڑی تھی۔ اس کی نظریں اس جگہ جمی تھیں جہاں کبھی اس کی سلطنت آباد تھی، جہاں اس کے محنتی ہاتھوں نے ایک خواب کی تعبیر کی تھی، جہاں زندگی ایک ہم آہنگی سے چل رہی تھی، اور جہاں اس کے سپاہی اور خدمت گار شب و روز محنت میں مشغول رہتے تھے۔ مگر اب وہاں صرف ٹوٹی ہوئی دیواروں کا ملبہ تھا، اور ہر طرف بکھری ہوئی چھوٹی چھوٹی نشانیاں کہ یہاں کبھی ایک ریاست تھی، ایک گھر تھا، ایک محفوظ پناہ گاہ تھی۔

ہوا کے جھونکے بکھری ہوئی باقیات کو اُڑاتے، اُٹھاتے، اور پھر کہیں دور لے جاتے۔ وہ لمحہ بھر کے لیے اپنی بے بسی پر نظر ڈالتی اور پھر اپنی نگاہیں ملبے کی گواہی پر جما دیتی۔ اس کے خزانے لوٹ لیے گئے تھے، اس کے سپاہی تتر بتر ہو چکے تھے، اور اس کی ریاست ایک بے جان خواب کی مانند ہو چکی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ یہ کوئی پہلا حملہ نہیں تھا، اور نہ ہی یہ آخری ہوگا۔ اُس کے لوگوں نے دن رات کی محنت سے اپنی ریاست کو خوشحال کیا تھا، ہر چیز منصوبہ بندی سے بنائی تھی، مگر چند طاقتور ہاتھوں نے لمحوں میں سب کچھ برباد کر دیا۔ ان ہاتھوں میں وہ قوت تھی جس کے سامنے وہ اور اس کے ساتھی بے بس تھے۔ ایک لمحے میں سب کچھ لُٹ چکا تھا، محض چند ثانیے اور سارا اثاثہ بکھر چکا تھا۔

کچھ لمحوں کے لیے وہ اپنی مملکت کے پرانے دنوں کو یاد کرنے لگی۔ کیسے سب مل کر کام کرتے، کیسے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہر شخص اپنی ذمہ داری نبھاتا، کیسے اُن کے ہاتھوں میں عزم تھا اور ذہن میں محنت کا نور۔ اور اب؟ اب ہر چیز خاکستر

ہو چکی تھی۔

اُس کی نظریں ان راستوں پر جا پڑیں جہاں اُس کے وفادار ساتھی بھٹک رہے تھے۔ کچھ تھکن سے نڈھال، کچھ خوفزدہ، کچھ حیران اور کچھ گم صم۔ ان کی آنکھوں میں سوال تھے، ان کے چہروں پر بے یقینی تھی۔ کیا سب کچھ ختم ہو چکا تھا؟ کیا اب دوبارہ کچھ نہیں بسے گا؟ کیا وہ برباد ہو چکے تھے؟

مگر ملکہ کی پیشانی پر کوئی شکن نہ آئی۔ اُس کا دل زخمی ضرور تھا، مگر اس کی روح کمزور نہیں ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ آزمائش کا وقت ہے۔ وہ جانتی تھی کہ جو گرنے کے بعد اُٹھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، وہی تاریخ میں زندہ رہتے ہیں۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا، جیسے کسی غیبی مدد کی امید کر رہی ہو۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ معجزے اُن کے لیے ہوتے ہیں جو ہمت رکھتے ہیں۔

اُس نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی، بکھری ہوئی ریاست کی حالت پر ایک گہری نظر ڈالی، اور پھر آہستہ سے ایک فیصلہ کر لیا۔ اُس نے ایک لمبی سانس لی اور اپنی کمر سیدھی کی۔ وہ کوئی عام حکمران نہیں تھی، وہ کوئی ایسی رانی نہیں تھی جو شکست مان لے۔ وہ کھوئی ہوئی چیزوں کا ماتم کرنے نہیں بیٹھی تھی، وہ آنے والے کل کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔

"ہم پھر سے اٹھیں گے۔" اس نے خود سے کہا۔

ملکہ نے اپنی نظر بکھرے ہوئے راستوں پر دوڑائی جہاں اُس کے سپاہی اور خدمت گار بے یقینی کے عالم میں بھٹک رہے تھے۔ کچھ تھکن سے نڈھال تھے، کچھ بے مقصد ادھر اُدھر گھوم رہے تھے، اور کچھ اب بھی اس صدمے میں تھے کہ اُن کا گھر، اُن کی محنت، اُن کا سب کچھ لمحوں میں چھین لیا گیا تھا۔

مگر ملکہ کا چہرہ پُرسکون تھا، اس کی آنکھوں میں ایک غیر متزلزل عزم جھلک رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ بھی مایوسی کے جال میں الجھ گئی، تو اس کا پورا قافلہ بکھر جائے گا۔ اگر اس نے ہمت ہار دی، تو تاریخ میں اُس کا نام صرف ایک ہاری ہوئی ملکہ کے طور پر لیا جائے گا، جو اپنی ریاست کے بکھرنے کے بعد اسے جوڑنے کا حوصلہ نہ رکھ سکی۔

اس نے اپنی آواز بلند کی، ایک صدا جو تھکے ہوئے دلوں کو پھر سے بیدار کر سکتی تھی۔ "ہم گر سکتے ہیں، مگر ہم بکھر نہیں سکتے! ہم لُٹ سکتے ہیں، مگر ہم مٹ نہیں سکتے! ہم دوبارہ اٹھیں گے، ہم پھر سے تعمیر کریں گے، اور اس بار پہلے سے زیادہ مضبوط ہوں گے"!

اس کے الفاظ ہوا میں لرزے، اور پھر آہستہ آہستہ، جیسے خزاں رسیدہ پتوں میں ہلکی ہلکی جان سی آنے لگی۔ وہ جو ساکت

کھڑے تھے، انہوں نے سر اُٹھایا۔ وہ جو تھکن سے چور تھے، انہوں نے قدموں کو حرکت دی۔ وہ جو مایوسی کے اندھیروں میں ڈوب چکے تھے، ان کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک اُبھری۔

پھر ایک نیا سفر شروع ہوا۔

ملکہ نے اپنے قریبی رفقاء کو بلا کر نیا منصوبہ تیار کیا۔ بکھری ہوئی سلطنت کو ایک بار پھر جوڑنے کے لیے ہر کسی کو اس کے کردار کا تعین کرنا تھا۔ کچھ محافظوں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ مستقبل میں ہونے والے کسی بھی حملے سے بچاؤ کے لیے ریاست کی سرحدوں کی نگرانی کریں۔ کچھ کو نئے ٹھکانے بنانے کا کام دیا گیا تا کہ ریاست پھر سے آباد ہو سکے۔ اور کچھ کو اِس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ بکھرے ہوئے ساتھیوں کو ڈھونڈیں اور انہیں دوبارہ اکٹھا کریں۔

یہ کام آسان نہ تھا۔ دن رات کی مسلسل محنت، بے انتہا مشکلات، اور ہر لمحہ کسی نئے خطرے کا سامنا۔ کبھی ایک جگہ پر تعمیر شروع ہوتی، تو معلوم ہوتا کہ وہاں کی زمین سازگار نہیں۔ کبھی کوئی نیا ٹھکانہ بنایا جاتا، تو معلوم ہوتا کہ دشمن کی نظر میں آ گیا ہے۔ مگر وہ سب ملکہ کے حکم پر، اس کے حوصلے کو دیکھتے ہوئے، آگے بڑھتے رہے۔

رفتہ رفتہ، ایک نئی ریاست کے آثار دکھائی دینے لگے۔ جو کبھی بکھرے ہوئے تھے، وہ ایک ساتھ جڑ گئے۔ جو کبھی مایوس تھے، وہ اپنے ہاتھوں سے ایک نیا خواب بُننے لگے۔ ملکہ خود ہر کام کی نگرانی کرتی، خود اپنے ہاتھوں سے تعمیر میں حصہ لیتی۔

دن گزرتے گئے، اور جو کل ایک ویران جگہ تھی، آج پھر سے ایک نئی زندگی کی علامت بن رہی تھی۔ یہاں ہر شخص جانتا تھا کہ وہ کسی بڑے مقصد کا حصہ ہیں، وہ صرف اپنی زندگی گزارنے کے لیے نہیں بلکہ ایک خواب کو حقیقت بنانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔

ملکہ جب اپنی نئی ریاست کو دیکھتی، تو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی جھلکنے لگتی۔ وہ جانتی تھی کہ خطرہ اب بھی منڈلا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ طاقتور ہاتھ ابھی بھی گھات میں تھے۔ مگر اس بار اس کے پاس ایک سبق تھا، ایک تجربہ تھا، اور سب سے بڑھ کر، ایک ایسی قوم تھی جو ایک بار بکھر کر دوبارہ کھڑی ہوئی تھی۔

اس کے دل میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ "ہم پھر سے جی رہے ہیں"! اس نے سوچا۔

لیکن وقت ابھی پوری طرح مہربان نہیں ہوا تھا۔ امتحان ابھی باقی تھا۔

رات کے خاموش سائے آہستہ آہستہ درختوں پر پھیل رہے تھے۔ ریاست ایک بار پھر روشنیوں سے جگمگانے لگی تھی۔ جو

بکھر چکے تھے، وہ یکجا ہو چکے تھے۔ جو مایوس تھے، وہ دوبارہ امید کے چراغ جلا چکے تھے۔ ہر طرف محنت کی خوشبو بکھری تھی، جیسے کوئی نئی صبح کی نوید دے رہی ہو۔

ملکہ فخریہ انداز میں اپنی سلطنت کا نظارہ کر رہی تھی۔ ہوا میں زندگی کی گونج تھی، ہر طرف مصروفیت کا عالم تھا۔ اُس کے سپاہی اور خدمت گار مستعد تھے، قلعے کی دیواریں مضبوط ہو چکی تھیں، اور ہر شخص اپنے حصے کا کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اب کسی قسم کا خطرہ نہیں، اب کوئی طاقت اُن کی محنت کو برباد نہیں کر سکتی۔

مگر ملکہ جانتی تھی کہ خطرہ ہمیشہ کمین گاہوں میں چھپا رہتا ہے، اُس کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دیتی، **مگر** وہ ہمیشہ تاک میں رہتا ہے۔

اور پھر، وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔

دن کے پچھلے پہر، جب دھوپ مٹی میں گھل رہی تھی، اچانک زمین لرز اٹھی۔ وہی ظالم ہاتھ، وہی بے رحم طاقت، ایک بار پھر سب کچھ روندنے کے لیے چلی آئی تھی۔ چیخ و پکار کی کوئی گونج نہ تھی، کوئی وارننگ نہ تھی، کوئی رحم کی گنجائش نہ تھی—بس ایک لمحے میں وہ سب کچھ جو محنت سے کھڑا کیا گیا تھا، راکھ میں بدل چکا تھا۔

محافظوں نے مزاحمت کی، خدمت گاروں نے بچانے کی کوشش کی، **مگر** طاقتور پنجے زیادہ مضبوط تھے۔ ہر چیز ایک بار پھر بکھر گئی، قلعے کی بنیادیں لرز اٹھیں، اور جو کچھ بچا تھا، وہ ملبے میں دفن ہو گیا۔

ملکہ ایک بار پھر اسی درخت کے نیچے کھڑی تھی جہاں کچھ عرصہ پہلے وہ اپنی پہلی شکست پر کھڑی تھی۔ منظر وہی تھا، درد وہی تھا، بربادی کی شدت وہی تھی۔

مگر ایک چیز مختلف تھی—اس کا دل اس بار خوفزدہ نہیں تھا۔

اُس نے اپنی بکھری ہوئی ریاست کو دیکھا، اپنے منتشر سپاہیوں کو دیکھا، اور ایک گہری سانس لی۔ یہ درد نیا نہیں تھا۔ یہ زخم پہلے بھی آئے تھے۔ **مگر** جو لوگ ایک بار ملبے سے اٹھ کھڑے ہوں، انہیں دوبارہ گرنے کا ڈر نہیں ہوتا۔

اس نے اپنی مٹھی بند کی، اپنے قدم جمائے، اور اپنی نظریں دوبارہ افق پر گاڑ دیں۔

"ہم پھر سے اٹھیں گے۔"

یہ شکست نہیں تھی، یہ ایک اور آغاز تھا۔

تقسیم

سورج کی نرم سنہری کرنیں دھرتی پر بکھر رہی تھیں، مگر اس کی روشنی کسی معجزے کی نوید نہ دے رہی تھی، بلکہ گاؤں کے ان تھکے ماندے مزدوروں کے لیے وہی عام دن کا آغاز تھا۔ وہی کھیت، وہی کدال، وہی جلتی ہوئی زمین، اور وہی خالی ہاتھوں کی بدقسمتی جو نسل در نسل ان کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔

رمضان، جو زندگی کی سنگلاخ راہوں میں سفر کرنے والا ایک سادہ مگر مضبوط دیہاتی تھا، انہی کھیتوں میں اپنا خون پسینہ بہانے والا ایک عام مزدور تھا۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی، جیسے برسوں کی محنت نے اس کے بدن پر اپنی گہری لکیریں کھینچ دی ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی کا ایک ایسا سایہ تھا جو کسی تھکے ہارے مسافر کی طرح پلکوں پر پڑا رہتا ہے۔ اس کی داڑھی بے ترتیب، کپڑے بوسیدہ، اور پاؤں میں گھسے ہوئے چمڑے کے جوتے، جو اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے۔

گاؤں کی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے رمضان کے قدموں میں ایک عجیب سی گرانی تھی، جیسے وہ زمین پر نہیں، اپنی تقدیر کے بوجھ پر قدم رکھ رہا ہو۔ اس کا دل اس کی بیوی کے بیمار جسم کی طرح ناتواں تھا۔ سکینہ، جو کبھی اس کی زندگی کی روشنی تھی، اب چارپائی پر پڑی زندگی اور موت کی سرحد پر تھی۔ اس کا زرد چہرہ، خشک ہونٹ اور کمزور ہاتھ رمضان کے دل کو چھلنی کر دیتے۔

صبح جب وہ کھیت کی طرف جا رہا تھا، اس کی بیوی نے دھیمی آواز میں کہا تھا:

"رمضان، اگر دوا نہ ملی تو شاید میں زیادہ دن نہ جی سکوں۔"

یہ جملہ رمضان کے دل پر کسی پتھر کی طرح گرا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ غربت میں سب کچھ سہنا ممکن ہے، مگر اپنے پیارے کو تڑپتے دیکھنا نا قابلِ برداشت ہوتا ہے۔

کھیت میں پہنچ کر اس نے کدال زمین میں گاڑ دی، مگر اس کے ہاتھوں میں وہ توانائی نہ رہی تھی جو کل تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا، جیسے کوئی پیاسا پانی کی امید میں لب تر کر رہا ہو۔ اس کے ساتھی مزدور اس کی طرف دیکھتے، مگر کوئی کچھ نہ کہتا۔ سب جانتے تھے کہ رمضان کی زندگی ایک ایسی کہانی ہے جس میں خوشی کا کوئی باب نہیں۔

وہ سارا دن کھیت میں مشقت کرتا رہا، مگر آج کا دن عام دنوں سے زیادہ بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ ہر بار جب وہ کدال زمین میں گاڑتا، اسے یوں لگتا جیسے زمین اس کی امیدیں نگل رہی ہو۔ سورج بلند ہوتا گیا، پسینہ اس کی پیشانی سے بہہ کر مٹی میں جذب ہوتا گیا، مگر سکینہ کے علاج کے لیے تین سو روپے کا سوال جوں کا توں باقی رہا۔

شام ڈھلتے ہی رمضان مزدوری سے فارغ ہو کر گھر لوٹا۔ مٹی میں اٹے قدم اور کپڑوں پر پسینے اور دھول کے دھبے، اس کی زندگی کے بے بسی کا اظہار کر رہے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سکینہ نے نحیف آواز میں پوچھا:

" کچھ ملا؟"

رمضان نے سر جھکا دیا۔ " کل دیکھوں گا، اللہ کوئی وسیلہ بنا دے گا۔"

مگر وہ جانتا تھا کہ یہ جملہ صرف تسلی تھی، حقیقت کچھ اور تھی۔ وہ کیسے رقم کا انتظام کرے؟ کہاں سے لائے وہ پیسے جو اس کے پاس کبھی تھے ہی نہیں؟ رات کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور رمضان کا دل ایک بند گلی میں قید ہو چکا تھا۔

اگلی صبح، سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی رمضان نے اپنے وسائل تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے وہ گاؤں کے زمیندار کے در پر گیا، جس کی زمینوں پر وہ برسوں سے کام کر رہا تھا۔ اس نے لجاجت سے کہا:

" مالک، اگر تین سو روپے قرض مل جائے تو بہت مہربانی ہوگی، سکینہ کی دوا کے لیے ضروری ہے۔"

زمیندار نے تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور ہنکارہ بھرتے ہوئے بولا: " رمضان! تم مزدور ہو، قرض دے کر میں کیا کروں گا؟ مزدوری میں اضافہ چاہیے تو بولو، مگر مفت کا پیسہ مانگنے کی عادت مت ڈالو۔"

یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا، اور رمضان کی امیدوں کا چراغ ایک لمحے میں بجھ گیا۔

اس کے بعد وہ گاؤں کی مسجد کے امام کے پاس گیا۔ امام صاحب نے ہمدردی سے اس کی بات سنی، مگر مسجد کے چندے میں پہلے ہی ضرورت مندوں کے نام درج تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اگلے جمعہ کو اگر ممکن ہوا تو کچھ مدد کر دیں گے۔

مگر سکینہ کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔

رمضان نے ایک اور امید کے سائے میں گاؤں کے پرانے دکان دار کے پاس جا کر عرض کی: "چاچا، کچھ ادھار مل سکتا ہے؟ جیسے ہی مزدوری ملے گی، لوٹا دوں گا۔"

بوڑھے دکاندار نے دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھا اور سرد آہ بھرتے ہوئے کہا:

"بیٹا، حالات سب کے برے ہیں۔ میری دکان کا بھی گزارا مشکل سے ہوتا ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟ اللہ بہتر کرے گا۔"

ہر دروازہ جو اس نے کھٹکھٹایا، اس کے لیے بند ہی پایا۔ وقت گزرتا گیا، سورج غروب ہو چکا تھا، اور رمضان کی آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا تھا۔ اس کی جیب خالی تھی، امیدیں بکھر چکی تھیں، مگر سکینہ کی نحیف آواز اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

اب ایک ہی راستہ باقی تھا۔ اس کا پرانا دوست، جو گاؤں کے دوسری طرف، بڑی سڑک کے پار رہتا تھا۔ شاید وہ مدد کر سکے۔ آخری امید کی روشنی میں، رمضان نے صبح اس سے ملنے جانے کا فیصلہ کیا۔

اگلی صبح رمضان اندھیرے میں ہی روانہ ہو گیا۔ وہ ننگے پاؤں کچی راہگزر پر چل رہا تھا، اس کے قدموں کے نیچے پڑی ہوئی گھاس شبنم سے بھیگی ہوئی تھی۔ جیسے ہی وہ ہائی وے کے قریب پہنچا، اچانک ایک زوردار آواز سنائی دی۔ سامنے ایک کار الٹ چکی تھی، دھواں اٹھ رہا تھا، اور گاڑی کے اندر دو افراد پھنسے ہوئے تھے۔

وہ قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک شخص بے ہوش تھا اور دوسرا کراہ رہا تھا۔ اس کے پاؤں گاڑی کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ مدد کی فریاد کرتے ہوئے اس شخص نے رمضان کی طرف دیکھا، مگر رمضان بے بسی سے کھڑا رہا۔

اچانک اس کی نظر زمین پر پڑی ایک کھلی ہوئی بٹوے پر پڑی، جس میں کرنسی نوٹ جھلک رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل تذبذب

میں پڑ گیا، مگر پھر اس نے بٹوے کو مضبوطی سے پکڑا، ایک نظر زخمی کی طرف دیکھا اور خاموشی سے پلٹ کر گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

گھر آ کر اس نے پیسے گنے تو پورے تین سو روپے تھے۔

پہلا انسان

میں ایک تعلیم یافتہ انسان ہوں۔ میرا نام اور میرا مقام اس دنیا میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ میں نے اپنے شعور کی بنیاد فلسفے کی موٹی کتابوں، سائنسی تحقیقات اور نفسیات کے پیچیدہ نکات پر رکھی۔ میری زندگی ایک ترتیب شدہ لائبریری کی مانند ہے، جہاں ہر خیال، ہر احساس اور ہر جذبہ اپنی جگہ پر منظّم اور قابو میں ہے۔

بچپن ہی سے میرے اندر ایک غیر معمولی ذہانت کی جھلک تھی۔ میرے استاد حیران ہوتے کہ میں کس طرح مشکل ترین مسائل کو لمحوں میں حل کر لیتا ہوں۔ زمانہ طالب علمی میں، میں نے علم کے سمندر کو کھنگال ڈالا۔ میں نے سائنس پڑھی، فلسفہ سیکھا، نفسیات کو جانچا، اور شاعری کو پرکھا۔ میری گفتگو میں ایک نرالی وقعت تھی، لوگ مجھے سننے کے لیے بے تاب رہتے۔

میرا معاشرتی رتبہ بھی کم نہ تھا۔ میں دانشوروں کی مجلس میں بیٹھتا، علمی مذاکروں میں حصہ لیتا، اخبارات میں میرے مضامین شائع ہوتے، اور علمی دنیا میں میرے خیالات کو سنجیدگی سے سنا جاتا۔ میں جانتا تھا کہ جذبات انسان کو کمزور کر دیتے ہیں، اس لیے میں نے خود کو ایک فولادی دیوار میں قید کر لیا تھا۔

میرے لیے محبت ایک افسانہ تھی، غصہ ایک غیر ضروری لذت، اور رنج والم صرف الفاظ کے کھیل۔ اگر کوئی حادثہ پیش آتا تو میں اس کا تجزیہ کرتا، مگر میرے لبوں پر افسوس کا ایک حرف بھی نہ آتا۔ میں ہنستا تھا، مگر ہنسی کی وجہ محض حالات کی عقلی تفہیم ہوتی۔ میں اداسی کو سمجھتا تھا، مگر اپنے چہرے پر اس کا رنگ نہیں آنے دیتا۔ میں جذبات کے وجود کو تسلیم کرتا تھا، مگر انہیں اپنی زندگی میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیتا۔

یہی میری عظمت تھی۔ میں اپنے آپ پر مکمل قابو رکھتا تھا۔ کوئی بھی صورت حال ہو، میں ہمیشہ متوازن، متین اور خاموش

رہا کرتا۔ میری پیشانی پر کبھی غصے کی لہر نہ اٹھتی، میرے لہجے میں کبھی محبت کی چاشنی نہ آتی، اور میری آنکھوں میں کبھی آنسو نہ جھلکتے۔ میں ایک ایسا شخص تھا جسے جذبات نے کبھی چھوا تک نہ تھا۔

لیکن شاید... شاید انسان خود پر مکمل قابو نہیں پا سکتا۔ شاید کہیں نہ کہیں جذبات اپنا راستہ بنا ہی لیتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کب، کہاں اور کیسے، مگر میرے اندر ایک ہلچل شروع ہوئی۔ ایک ایسی ہلچل جو بہت معمولی تھی، مگر وہ موجود تھی۔ وہ ہلچل جو دھیرے دھیرے ایک طوفان بننے جا رہی تھی۔

یہ ایک اجنبی کیفیت تھی۔ میں کسی محفل میں موجود ہوتا، گفتگو چل رہی ہوتی، لیکن کہیں نہ کہیں میرے ذہن میں کوئی غیر واضح سا احساس پیدا ہونے لگتا۔ یہ ایک ہلکی سی دستک تھی، جیسے کسی ویران دروازے پر آہستہ سے کوئی انگلیاں بجا رہا ہو۔ پہلے تو میں نے اسے نظر انداز کیا، ایک معمولی سی بے چینی سمجھ کر جھٹک دیا۔ مگر یہ احساس بار بار آنے لگا، پہلے ہلکی سرگوشی کی طرح، پھر ایک مستقل موجودگی کی مانند۔

یہ ایک عجیب کیفیت تھی، جیسے ذہن کی گہرائیوں میں کوئی لہر اٹھ رہی ہو۔ میں خود سے سوال کرتا: کیا میں غصہ محسوس کر رہا ہوں؟ کیا یہ محبت ہے؟ یا شاید کوئی پرانی یاد، کوئی بھولی بسری تکلیف؟ میں نے فوراً خود کو سنبھالا، اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میرے چہرے پر تغیر محسوس کرے، کسی کو یہ معلوم ہو کہ میرے اندر کچھ ہلچل مچا رہا ہے۔ میں نے خود کو اپنی عقل کے مضبوط حصار میں قید کر لیا، جذبات کی ہر رمق کو اپنے سخت منطق سے کچل دیا۔

جذبات نے میرے ذہن میں جڑ پکڑ لی۔ اب یہ کوئی ہلکی سرگوشی نہیں تھی بلکہ ایک مستقل شور کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ میں کسی سے بات کرتا، لیکن اندر ہی اندر احساسات کا ایک سیلاب رواں دواں رہتا۔ دل کبھی انجانی خوشی سے دھڑکنے لگتا، تو کبھی بنا کسی وجہ کے اداسی کا سایہ پھیلنے لگتا۔

اب ہر لمحہ میرے اندر کسی نہ کسی جذباتی کیفیت کا طوفان اٹھتا۔ میں ظاہری طور پر خاموش رہتا، مگر میرے دماغ میں سوالات کی بوچھاڑ ہوتی: میں کیوں اداس ہوں؟ میں کیوں کسی سے محبت محسوس کر رہا ہوں؟ میں کیوں کسی کے لیے ہمدردی محسوس کر رہا ہوں؟ کیا میں کمزور ہو رہا ہوں؟ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میرے اندر کے تغیر کو محسوس کرے، اس لیے میں اور زیادہ سختی سے خود پر قابو پانے لگا۔

میں نے آئینہ دیکھا تو ایک اجنبی کو پایا۔ میرا چہرہ، جو ہمیشہ سنجیدہ اور غیر جانبدار رہا تھا، اب بدلنے لگا تھا۔ کبھی آنکھوں میں نمی محسوس ہوتی، کبھی لبوں پر ایک ہلکی سی لرزش۔ خون کی گردش تیز ہو چکی تھی، دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو رہی تھی۔

میں نے خود کو قابو میں رکھا، لیکن میرے چہرے پر جذبات کی پرچھائیاں ظاہر ہونے لگیں۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی کو اندازہ نہ ہو کہ میرے اندر کیا چل رہا ہے، لیکن میرے ماتھے کی شکنیں، آنکھوں کی نمی، ہونٹوں کی ہلکی لرزش سب کچھ بیان کر رہی تھیں۔

اب میرا جسم بھی بغاوت کرنے لگا۔ میری ہتھیلیاں پسینے سے تر ہونے لگیں، میرا درجہ حرارت بڑھنے لگا، میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ میں ایک ہموار چہرہ لیے، خاموش بیٹھا رہتا، لیکن اندر ایک زلزلہ برپا تھا۔ کوئی مجھ سے بات کرتا تو میں سر ہلا دیتا، لیکن میری انگلیاں غیر محسوس انداز میں لرزتی رہتیں۔

اب یہ جذبات صرف میرے اندر نہیں رہے، وہ میرے ہونٹوں سے پھسلنے لگے۔ میں اکیلا بیٹھا ہوتا اور خود سے باتیں کرتا۔ الفاظ، بے ترتیب جملے، خود سے کیے گئے سوالات۔ میں نے انہیں دبانے کی کوشش کی، لیکن وہ بار بار نکل آتے۔

اب صرف میرا ذہن اور زبان نہیں، میرا پورا وجود ان جذبات کے شکنجے میں تھا۔ میری آنکھیں کبھی بند ہوتیں، کبھی کھل جاتیں، میرے بازو غیر ارادی طور پر حرکت کرتے، میرے سر کو ایک غیر مرئی بوجھ جھکا دیتا۔ میرے قدم لرزتے، جیسے زمین پر گرفت کھوتے جا رہے ہوں۔ میں چلتا، رکتا، پیچھے مڑتا، بغیر کسی وجہ کے۔

ایک دن، میں قابو کھو بیٹھا۔ ایک ہجوم میں، کسی معمولی بات پر، میں چلانے لگا۔ میں نے دیواروں کو مکے مارے، میں نے اپنی قمیض پھاڑ دی۔ میں چیختا، دھاڑتا، جیسے میرے اندر کوئی طوفان قید ہو، جو باہر نکلنے کی جدوجہد کر رہا ہو۔ لوگ مجھے دیکھنے لگے، خوف سے، حیرت سے۔ میں گر گیا، میرے ہاتھ پتھروں پر پڑے، میرا جسم کانپتا رہا۔

وہ آئے، مجھے اٹھایا، میرے ہاتھ باندھے، مجھے ایک تاریک، سنسان کمرے میں ڈال دیا۔ یہاں صرف دیواریں تھیں، جنہیں میں گھورتا رہتا، جن سے میں باتیں کرتا۔ میں جانتا تھا کہ میں کون تھا، میں جانتا تھا کہ میں کیا ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں پاگل ہو چکا تھا۔

لیکن یہ سب کیسے ہوا؟ کیا میں واقعی پاگل ہوں؟ یا شاید۔۔۔ شاید میں اب اصل میں ہوش میں آیا ہوں؟ شاید یہ دنیا ہی پاگل ہے، اور میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے اسے پہچان لیا۔

جنگل کا راجہ

گھنا جنگل، جہاں ہریالی کی چادر ہر شے کو ڈھانپے ہوئے تھی، ایک پُر اسرار دنیا کی مانند لگتا تھا۔ درختوں کی بلند و بالا شاخیں آسمان سے ہم کلام تھیں اور ان کے درمیان سے چھن کر آتی دھوپ زمین پر سنہری فرش بچھا دیتی تھی۔ ایک طرف ندی بہتی تھی، جس کا پانی شفاف تھا اور اس میں عکس پڑنے سے چاندی جیسی جھلملاہٹ پیدا ہوتی تھی۔ اس جنگل میں بکریوں اور بھیڑوں کے ریوڑ امن و سکون سے چرتے، زندگی کی روانی میں مگن تھے۔ وہ آزاد تھے، مگر بے خبر بھی تھے۔ ان کے اردگرد، درختوں کے سائے میں، کچھ آنکھیں ہر وقت ان پر نظر رکھے بیٹھی تھیں۔

یہ آنکھیں شکاریوں کی تھیں۔ شیر، چیتا، بھیڑیا اور تیندوا— سب اپنی اپنی چالاکیوں کے ساتھ تاک میں تھے۔ یہ درندے طاقت کے بھوکے تھے، اور ہر ایک چاہتا تھا کہ بس وہی اس جنگل کا واحد حکمران ہو، تاکہ بکریوں اور بھیڑوں پر بلا شرکتِ غیرے حکومت کر سکے اور انہیں اپنی خوراک بنا سکے۔

اسی کشمکش کے باعث، ایک دن جنگل کے بیچوں بیچ، ایک کھلی عدالت کا انعقاد ہوا۔ ایک درخت کے نیچے، ایک ادھیڑ عمر انسان بیٹھا تھا، جو بظاہر ایک عام انسان لگتا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں گہری دانائی تھی۔ وہی اس عدالت کا منصف تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک مضبوط اور لمبا عصا پکڑا ہوا تھا۔

شیر نے سب سے پہلے قدم بڑھایا۔ اس کی چال میں بے پناہ وقار اور رعونت تھی۔ اس نے اپنی زوردار گرج کے ساتھ کہا:

"میرے جنگل کے باسیو! میں بادشاہ ہوں۔ حکم رانی کی سب سے بڑی خوبی استحکام ہے۔ جب ایک ہی حکمراں ہو، تو جنگل میں کوئی انتشار نہیں ہوتا۔ میری حکومت میں، ہر ذی روح کو اپنے مقام کا علم ہوگا۔ کم زور اپنی کم زوری کو پہچانے

گا اور طاقتور کی عظمت تسلیم کرے گا۔ رعایا کو ایک مضبوط ہاتھ کی ضرورت ہوتی ہے، جو انہیں قابو میں رکھے اور ان کے تحفظ کا ضامن ہو۔ اگر میں جنگل کا اکیلا حکمران بنوں، تو میں فیصلہ کروں گا کہ کون جئے اور کون نہ جئے۔ اس سے جنگل میں نظم وضبط پیدا ہوگا، اور تم سب ایک طاقتور قیادت کے ماتحت رہو گے۔"

شیر نے اپنی تقریر ختم کی اور اپنے پُرغرور انداز میں گردن اٹھائی۔ لیکن جیسے ہی وہ پیچھے ہٹا، بھیڑیا مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔

"بادشاہت؟" بھیڑیے نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "یہ تو بس ایک ظالم کا خود کو مقدس بنانے کا بہانہ ہے! بادشاہت میں ساری طاقت ایک ہی ہاتھ میں ہوتی ہے، اور وہ طاقت ظلم کو جنم دیتی ہے۔ اگر شیر حکمران بن گیا، تو یہ سب بھیڑیں اور بکریاں اس کی ذاتی ملکیت بن جائیں گی۔ وہ جسے چاہے مار ڈالے، اور کسی کو جوابدہ نہ ہو! ایک عقلمند نظام میں طاقت چند ہاتھوں میں ہونی چاہیے، نہ کہ کسی ایک درندے کے پنجوں میں۔"

بھیڑیے کی بات پر شیر نے غرا کر اسے گھورا، مگر بھیڑیا پرسکون کھڑا رہا۔

اب سب کی نظریں چیتے پر تھیں، جو اپنی حکمرانی کے حق میں دلائل دینے والا تھا۔

چیتے نے اپنی مخصوص چال میں آگے بڑھتے ہوئے کہا:

"میرے جنگل کے باشندو! طاقت اور رفتار ہی اصل حکمرانی کے اصول ہیں۔ میرا نظام حکومت ایک ایسی سلطنت کا خواب ہے جہاں کمزوروں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ میرا نظام تیز رفتاری، نظم وضبط اور طاقت پر مبنی ہے۔ صرف وہی زندہ رہنے کے حقدار ہیں جو خود کو مضبوط ثابت کریں۔ جنگل میں آزادی کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ اطاعت اور اتحاد ضروری ہے۔ جو میرے قوانین کی خلاف ورزی کرے گا، اسے نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ میرا راج جنگل کو طاقتور اور ناقابلِ تسخیر بنائے گا۔"

چیتے کی تقریر کے بعد باقی درندوں نے طنزیہ مسکراہٹوں کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بھیڑیے نے کہا:

"تمہارا نظام محض ایک بہانہ ہے کمزوروں کو کچلنے کا۔ طاقتور ہونا کافی نہیں، عقل اور تدبر بھی چاہیے، جو تمہارے سخت قوانین میں نہیں ملتے۔"

شیر نے دھاڑ کر کہا:

"تمہارا نظام ایک وقتی خوف پیدا کرے گا، لیکن جنگل میں دیرپا استحکام پیدا نہیں کر سکتا۔ حکمراں وہی کامیاب ہوتا ہے

جو عزت اور طاقت، دونوں سے حکومت کرے۔"

چیتے نے ان تنقیدوں کو نظر انداز کیا اور پرغرور انداز میں کھڑا رہا۔ اب سب کی نگاہیں تیندوے پر تھیں، جو اپنا نظریہ پیش کرنے والا تھا۔

وہ دھیرے سے آگے بڑھا، اور ایک گہری آواز میں گویا ہوا:

"میرے جنگل کے باسیو! میں مساوات اور برابری کا قائل ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں کوئی بادشاہ نہ ہو، نہ ہی کوئی غلام۔ سب کو برابر کا حق ملے، سب کو ایک جیسی خوراک اور ایک جیسی جگہ میسر ہو۔ ہمارے ہاں کوئی امیر نہیں ہوتا، کوئی غریب نہیں ہوتا۔ سب ایک ہی نظام کے تحت زندہ رہتے ہیں، اور سب کے وسائل برابر تقسیم ہوتے ہیں۔ یہاں کوئی مالک نہیں، کوئی رعایا نہیں۔ سب مل کر کام کرتے ہیں، اور سب کو برابر کا حصہ ملتا ہے۔ اگر میرا نظام رائج ہو، تو کوئی درندہ دوسروں پر ظلم نہیں کر سکے گا۔ ہم سب بھائیوں کی طرح رہیں گے اور ایک خوشحال معاشرہ تشکیل دیں گے۔"

تیندوے کی بات سن کر باقی درندے ہنسنے لگے۔ بھیڑیے نے کہا:

"یہ سب محض ایک خوبصورت خواب ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مساوات کے نام پر طاقت چند ہاتھوں میں سمٹ آتی ہے، اور اصل میں عوام بھوک اور افلاس کا شکار ہو جاتے ہیں۔"

چیتے نے غرایا: "اگر سب برابر ہو گئے، تو جنگل کی فطرت کا کیا ہوگا؟ قدرت نے کمزور اور طاقتور کو الگ بنایا ہے۔ تم اپنے فلسفے سے فطرت کو بدل نہیں سکتے"!

تیندوا خاموشی سے تنقید سنتا رہا۔ اب سب کی نظریں بھیڑیے پر تھیں، جو اپنا نظریہ پیش کرنے والا تھا۔

بھیڑیا بڑے لوگوں کی نمائندگی کرتا تھا۔ وہ نپے تلے قدموں سے آگے بڑھا اور ایک چالاک مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا:

"میرے جنگل کے باشندو! سب نظاموں میں انتشار ہے۔ بہترین حکومت وہ ہوتی ہے جو چند ذہین اور تجربہ کار افراد کے ہاتھ میں ہو۔ میرا نظام دانش ور لوگوں کی حکومت پر مبنی ہے، جہاں چند قابل اور دانا حکمران فیصلے کرتے ہیں اور باقی عوام ان کی دانشمندی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ طاقت کا ارتکاز چند ہوشیار درندوں میں ہونا چاہیے، تاکہ جنگل کی ترقی ممکن ہو سکے۔"

اب باقی درندے بھیڑیے کے نظام پر تنقید کرنے کے لیے تیار تھے۔

چیتے نے سب سے پہلے زبان کھولی، اس کی آنکھوں میں تیز چمک تھی:

"تمہارا اشرافیائی نظام محض طاقتوروں کا ایک اور جال ہے، جس میں چند مخصوص افراد ساری طاقت اپنے قبضے میں رکھ لیتے ہیں اور کمزوروں کو فیصلہ سازی کے حق سے محروم کر دیتے ہیں۔ یہ کوئی اصول نہیں، بلکہ چند ہوشیار درندوں کی خود غرضی ہے۔ جو فیصلے چند ہاتھوں میں ہوں، وہ کبھی بھی عام عوام کے مفاد میں نہیں ہوتے۔ تم اشرافیہ کے نام پر اسی ظلم کو دوام بخشنا چاہتے ہو جسے بادشاہت کے نام پر شیر، فسطائیت کے نام پر میں اور مساوات کے نام پر تیندوا نافذ کرنا چاہتا تھا"!

شیر نے قہقہہ لگایا، اس کے غرور میں ہلکی سی تمسخر کی جھلک تھی:

"بھیڑیے، تم عقل مندی کا دعویٰ کرتے ہو، مگر تمہارا نظام سب سے زیادہ کمزور ہے۔ جب فیصلے چند ہاتھوں میں ہوتے ہیں، تو ان میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ چند دانا حکمران جلد ہی ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، اور نتیجہ جنگل میں مزید انتشار کی صورت میں نکلتا ہے۔ طاقت ایک ہی ہاتھ میں ہو تو جنگل میں استحکام رہتا ہے، نہ کہ تمہارے جیسے چالاک مگر بے عمل درندوں کے درمیان بٹ جائے۔"

تیندوے نے نرم مگر سنجیدہ لہجے میں کہا:

"تم جس دانشمند اشرافیہ کی بات کرتے ہو، حقیقت میں وہی چند طاقتور درندے اپنے من پسند فیصلے مسلط کرتے ہیں۔ یہ نظام عوام کو ترقی دینے کے بجائے ان پر مسلط رہتا ہے۔ تمہاری اشرافیہ کی حکومت ہمیشہ چند مفاد پرست عناصر کے ہاتھوں یرغمال بن جاتی ہے، جو خود کو سب سے بہتر سمجھتے ہیں، جبکہ عام عوام کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ تم سب کا انجام بھی وہی ہوتا ہے جو بادشاہت کا ہوتا ہے — جبر، ظلم اور استحصال"!

بھیڑیے نے ان سب کی تنقید کو خاموشی سے سنا اور پھر ایک دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔ اب سب کی نظریں اس آخری درندے پر تھیں، جو ابھی تک خاموش کھڑا تھا — لومڑ۔ وہ عوامی حکومت کی نمائندگی کر رہا تھا۔

لومڑ نے ایک تیز نظر سب پر ڈالی اور نرمی سے کہا:

"میرے جنگل کے باشندو! تم سب طاقت کے خواہش مند ہو، مگر کیا تم نے کبھی سوچا کہ یہ جنگل آخر کس کا ہے؟ یہ شیر، چیتے، بھیڑیے یا تیندوے کا نہیں، بلکہ یہاں رہنے والی بکریوں اور بھیڑوں کا ہے۔ حکمرانی کا حق ان ہی کو ہونا چاہیے جو اکثریت میں ہیں، نہ کہ ان چند درندوں کو جو ہمیشہ اپنی بھوک مٹانے کے درپے رہتے ہیں۔ میرا نظام جمہوریت

ہے، جس میں سب کو برابری کا حق حاصل ہوتا ہے۔ جنگل کے فیصلے چند درندے نہیں، بلکہ سب مل کر کریں گے۔ ہر جانور کو اپنی رائے دینے کا حق ہوگا، اور حکومت وہی کرے گا جسے سب منتخب کریں گے۔ اس سے انصاف قائم ہوگا، ظلم کا خاتمہ ہوگا اور ہر جانور کو خوشحالی نصیب ہوگی۔"

لومڑ کی گفتگو میں ایک نرمی تھی، مگر باقی درندے اس کے نظریے پر مسکرانے لگے۔ اب سب اپنی باری کے منتظر تھے کہ وہ اس کی جمہوریت پر اعتراض کریں۔

لومڑ کے الفاظ جنگل میں ایک پل کے لیے گونج کی مانند پھیل گئے۔ اس نے جمہوریت کے خواب کو ایک حسین حقیقت کے طور پر پیش کیا، مگر دوسرے درندے اس نظریے پر طنزیہ مسکراہٹوں کے ساتھ غور کر رہے تھے۔ سب سے پہلے شیر نے آگے بڑھ کر اپنی گرجدار آواز میں کہا:

"یہ جمہوریت محض ایک فریب ہے"! اس نے دھاڑ کر کہا۔ "تم کہہ رہے ہو کہ فیصلے بھیڑوں اور بکریوں کے ہاتھ میں ہوں؟ وہ نا سمجھ، کمزور اور بیوقوف مخلوق، جو خود کو بھیڑیا دیکھ کر ہی کانپنے لگتی ہیں، وہ جنگل کا نظام چلائیں گی؟ جمہوریت کا مطلب ہے کہ بیخبر اور بے بس بھیڑیں یہ فیصلہ کریں گی کہ شیر یا چیتا ان پر راج کرے یا نہیں؟ ایک حکمران کا کام فیصلے کرنا ہوتا ہے، نہ کہ ہر نا سمجھ جانور سے مشورہ لینا۔ اگر جنگل کو ترقی دینی ہے، تو قیادت ایک طاقتور اور اہل حاکم کے ہاتھ میں ہونی چاہیے، نہ کہ ایک ایسے ہجوم میں جو خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتا"!

شیر کی بات سنتے ہی چیتا آگے بڑھا، اس کے انداز میں تیزی تھی:

"جمہوریت جنگل میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی"! اس نے کہا۔ "یہ جنگل طاقت کا کھیل ہے، یہاں ہر کوئی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اگر فیصلے بھیڑوں کے ہاتھ میں ہوں، تو وہ ہمیشہ اپنے مفاد میں فیصلے کریں گی اور درندوں کو بھوکا مرنے پر مجبور کریں گی۔ جب کمزوروں کو اختیار ملتا ہے، تو وہ سب سے پہلے طاقتوروں کے خلاف سازش کرتے ہیں، اور نتیجہ افراتفری کی صورت میں نکلتا ہے۔ جمہوریت دراصل کمزوروں کا وہ ہتھیار ہے جس سے وہ طاقتوروں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، اور یہ فطرت کے اصولوں کے خلاف ہے"!

بھیڑیے نے لومڑ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا:

"جمہوریت حقیقت میں اکثریت کی آمریت ہے"! اس نے چالاکی سے کہا۔ "یہ نظام دکھنے میں بہت خوبصورت ہے، مگر اس میں فیصلہ سازی نا اہلوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ جب ایک ہجوم مل کر فیصلہ کرتا ہے، تو وہ ہمیشہ اپنے

محدود مفاد کو ترجیح دیتا ہے اور دور اندیشی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بھیڑوں اور بکریوں کی اکثریت ہمیشہ ایسے فیصلے کرے گی جو درندوں کے حق میں نہ ہوں، اور نتیجہ صرف بدانتظامی اور کمزوری ہوگا۔ طاقتور طبقے کو چلانے کے لیے چند دانا دماغوں کی ضرورت ہوتی ہے، نہ کہ بیشمار کمزور آوازوں کی۔"

تیندوے نے بھی اپنی گہری آواز میں لومڑ پر اعتراض اٹھایا:

"یہ ایک سراب ہے"! وہ دھیرے سے بولا۔ "تمہارے نظریے کے مطابق جس کو زیادہ بھیڑ بکریاں پسند کریں گی وہی حکمران بنے گا؟ مگر بھیڑیں اور بکریاں کیا جانتی ہیں کہ بہترین حکمران کون ہوگا؟ وہ تو اپنے ہی فیصلوں میں بھٹکتی رہتی ہیں! کمزوروں کو حکمرانی دے دینا ایک ایسا جال ہے جس میں جنگل ہمیشہ الجھا رہے گا، اور نتیجہ لڑائی جھگڑے کے سوا کچھ نہیں نکلے گا"!

لومڑ خاموشی سے ان سب کے اعتراضات سنتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ درندے کبھی بھی جمہوریت کو قبول نہیں کریں گے، کیونکہ وہ سب اپنی اپنی بقا اور طاقت کے خواہشمند تھے۔

اب سب کی نظریں اس انسان پر تھیں، جو پوری خاموشی سے ان کی بحث سن رہا تھا۔ وہ درخت کے نیچے بیٹھا تھا، اس کی آنکھوں میں ایک گہری سوچ تھی۔ اچانک وہ اٹھا، اور ایک مضبوط ہاتھ سے ڈنڈے کو لہرایا۔

"بس بہت ہوا"! اس نے بلند آواز میں کہا۔ "تم سب کے سب صرف اپنی بھوک اور طاقت کی بات کر رہے ہو، مگر کسی نے یہ نہیں سوچا کہ ان بیچاری بھیڑوں اور بکریوں کا کیا ہوگا! تم سب حکمرانی کے خواہشمند ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ تمہاری حکمرانی میں وہی کمزور طبقہ ہمیشہ نقصان اٹھاتا رہے گا۔ تم میں سے کوئی بھی اس جنگل کو انصاف اور امن نہیں دے سکتا"!

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور ڈنڈے کے زور سے سب درندوں کو دور ہنکال دیا۔ شیر نے ایک دھاڑ ماری، چیتے نے غرایا، بھیڑیا پیچھے ہٹا، اور تیندوا خاموشی سے درختوں میں غائب ہوگیا۔

پھر اس نے آگے بڑھ کر بھیڑوں اور بکریوں کو اکٹھا کیا، اور انہیں ایک محفوظ دیوار کے اندر لے گیا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک یہ درندے جنگل میں موجود ہیں، کمزوروں کو تحفظ دینا ضروری ہے۔ اس نے دروازہ بند کیا، اور ایک آخری نظر جنگل کے اُس اندھیرے حصے پر ڈالی جہاں سے درندے ابھی بھی تاک میں تھے، مگر اب وہ بے بس نظر آ رہے تھے۔ اس نے باڑے کے دروازے کے آگے وہی عصا رکھا اور سکون سے ایک طرف بیٹھ گیا۔

دانش مند پرندے

یہ کہانی ایک ایسی وادی میں وقوع پذیر ہوتی ہے جہاں ہر طرف سرسبز پہاڑوں کی آغوش میں رنگ برنگے پرندوں کی دنیا آباد تھی۔ یہاں بلبلیں تھیں جو اپنی مترنم آوازوں سے ساعتوں میں سحر بکھیرتی تھیں، ان کے نغمے روح کی گہرائیوں میں اتر جاتے تھے۔ مور اپنی رعنائی اور خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھے، حسنِ مطلق کا پیکر جو ایک نظر میں دل کو موہ لیتا تھا۔ عقاب و شاہین اپنے جلال و جبروت کے مظہر تھے، جبکہ فاختائیں نرم خوئی، معصومیت اور محبت کی علامت تھیں۔

وادی میں صبح کا پہلا اجالا چھایا تو ہلکی بادِ نسیم نے درختوں کی شاخوں کو جھنجھوڑا، ندی کے پانی میں سنہری دھوپ کا عکس لرزنے لگا، اور پرندوں نے اپنی سریلی آوازوں میں خوش الحانی کا نغمہ چھیڑ دیا۔ یہ وادی حسن و جمال، رنگ و نور اور نغمہ و آہنگ کا ایک انمول مرقع تھی۔ یہاں کے باسی محض پرندے نہ تھے بلکہ ہر ایک میں ایک خاص جوہر تھا، ایک پہچان تھی۔

اسی وادی میں ایک روز ان پرندوں کی ایک مجلس منعقد ہوئی۔ موضوع تھا: خوب صورتی اور خوش الحانی کا معیار کیا ہے، کون خوب صورت ہے اور کس کی صوت دل ربا ہے۔ ہر پرندہ اپنی دانست میں اپنے کمال کو فن کی معراج سمجھتا تھا اور اپنے نظریے کو سب سے برتر جانتا تھا۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ ہر پرندہ اپنے نظریے کے حق میں دلائل دے گا۔

پرندوں کی مجلس میں سب سے پہلے ایک عظیم الشان عقاب اٹھتا ہے۔ اس کی زرد آنکھوں میں وقار اور بلندی کا غرور جھلکتا ہے۔ وہ اپنے سنہری پروں کو پھیلائے، ایک بلند شاخ پر بیٹھتا ہے اور اپنی گونج دار آواز میں گویا ہوتا ہے:

"اے اہلِ وادی! تم سب مختلف رنگوں، آوازوں، اور خیالات کے پرستار ہو، مگر میں تمہیں ایک ایسا اصولی راستہ دکھاؤں گا جو صدیوں سے حسن و فن کی بنیاد ہے۔

میرے نظریے کے مطابق حسن ایک متعین معیار رکھتا ہے۔ ہر شے کا ایک متوازن اور متناسب وجود ہوتا ہے، اور یہی حسن کی معراج ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ادب اور فن میں اعتدال، سادگی اور توازن ضروری ہے۔ کسی بھی تخلیق میں ہم آہنگی اور تناسب کا ہونا ہی اصل کمال ہے۔ دیکھو، سورج ہر روز ایک ہی سمت سے نکلتا ہے، ستارے ایک خاص قرینے سے اپنی جگہ پر چمکتے ہیں، دریا اپنی متعین گزرگاہوں میں بہتے ہیں — یہی حسن ہے، یہی فطرت کا قانون ہے۔

میں تمہیں یونان کے قدیم معماروں اور شاعروں کی مثال دیتا ہوں، جنہوں نے لازوال فن پارے تخلیق کیے۔ ہومر کی "الیڈ" ہو یا سوفوکلیز کے المیے، ہر شاہکار ایک مخصوص ڈھانچے اور نظم و ضبط کے تابع ہے۔ کوئی بھی چیز بے ساختہ نہیں، کوئی بھی لفظ بے محل نہیں۔ یہی اصول شاعری، مصوری، اور سنگتراشی میں لاگو ہوتا ہے۔

ہم جذبات کے بے مہار بہاؤ کو قبول نہیں کرتے، ہم فن کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے قائل ہیں۔ میرے پروں کو دیکھو! ہر پر اپنی جگہ متوازن ہے، میرے پنجے میری پرواز کے عین مطابق بنائے گئے ہیں، میری رفتار اور میری تیزی فطرت کے اصولوں کی مظہر ہے۔ یہی اصول ادب اور فنون لطیفہ میں کارفرما ہونا چاہیے۔

رومانویت اور ترقی پسندیت جیسے نظریات ایک ناپائیدار خواب ہیں، جو انسان کو انتشار اور بے راہ روی کی طرف لے جاتے ہیں۔ میں تمہیں یاد دلاتا ہوں کہ بہترین فن وہی ہے جو اصولوں پر مبنی ہو، جو صدیوں کی آزمائش میں ثابت قدم رہے، اور جو فطری حسن اور عقلی نظم کا آئینہ دار ہو"!

عقاب خاموش ہوتا ہے اور ایک لمحے کے لیے فضا میں گونجتی ہوئی اس کی آواز دم توڑتی ہے۔ اتنے میں ایک بلبل اپنی نغمہ بار آواز میں کہتی ہے:

"اے عقاب! تمہاری باتوں میں وقار تو ہے، مگر تم حسن کو ایک جامد اور غیر متغیر اصول کے تحت کیوں مقید کرتے ہو؟ حسن اور ادب جامد نہیں ہوتے، بلکہ یہ جذبات کی رو میں بہتے ہیں، یہ دل کی دھڑکن کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ شاعری اور فنون لطیفہ کو محض اصولوں کا پابند کرنا تو اس کے تخلیقی جوہر کو ختم کر دینا ہے"!

پھر ایک مور اپنی دم پھیلا کر کہتا ہے:

"اے عقاب! کیا تم نے میرے پروں کے رنگوں کو دیکھا؟ یہ رنگ اپنی جگہ پر متوازن تو ہیں، مگر ان کی اصل خوبصورتی ان کی چمک اور بے ساختہ ترکیب میں ہے۔ حسن ہمیشہ کسی متعین اصول میں قید نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات بے ساختگی میں زیادہ نکھر کر آتا ہے"!

کبوتر، جو ہمیشہ سکون اور نرمی کا حامی رہا ہے، دھیمے لہجے میں گویا ہوتا ہے:

"عقاب بھائی! نظم اور ضبط میں خوبصورتی تو ہے، مگر کیا تم نہیں دیکھتے کہ دنیا بدلتی رہتی ہے؟ کیا ادب کو بھی وقت کے ساتھ نہیں بدلنا چاہیے؟ جو اصول صدیوں پہلے ٹھیک تھے، کیا وہ آج بھی اسی طرح لاگو کیے جا سکتے ہیں؟"

الغرض، مجلس میں مختلف پرندے عقاب کے سخت اصولوں پر تنقید کرتے ہیں، مگر عقاب اپنے خیالات پر قائم رہتا ہے۔ وہ وادی کے بلند ترین درخت پر جا بیٹھتا ہے، گویا اس نے اپنے نظریے کی برتری کو مزید ثابت کر دیا ہو۔

جب عقاب خاموش ہوا اور وادی میں ہلکی ہلکی سرگوشیاں ہونے لگیں، تو ایک نازک مگر پُر جوش آواز نے فضا میں ارتعاش پیدا کیا۔ یہ ایک بلبل تھی، جو اپنی باریک، مگر مترنم آواز میں یوں گویا ہوئی:

"اے اہلِ وادی! حسن کو قاعدوں اور اصولوں میں قید کرنے والو، تم نے کبھی محبت کی دیوانگی دیکھی ہے؟ تم نے کبھی ایک عاشق کو چاندنی رات میں آسمان کی طرف تکتے نہیں دیکھا؟ تم نے کبھی کسی شاعر کو دل شکستہ ہو کر بہتے جھرنے کے کنارے بیٹھے نہیں پایا؟ یہی جذبات کی شدت، یہی بے ساختگی، یہی کرب اور سرشاری۔

اے عقاب! تم حسن کو ایک مخصوص پیمانے سے ناپتے ہو، مگر حسن تو دل کی کیفیت کا نام ہے۔ جو چیز ہمارے جذبات کو جھنجھوڑ دے، جو ہمارے دل کی گہرائیوں کو چُھو لے، وہی سچا فن ہے! تم طے شدہ اصولوں کی بات کرتے ہو، مگر میں تمہیں کہتی ہوں کہ فن کو کسی اصول میں مقید کرنا، اس کے جوہر کو ختم کرنا ہے۔

فطری حسن وہ ہوا ہے جو بے روک بہتی ہے، وہ دریا ہے جو اپنی راہ خود بناتا ہے، وہ آسمانی بجلی ہے جو کسی منطق یا اصول کی محتاج نہیں۔ میں تمہیں شیلے، کیٹس، اور ورڈزورتھ کے اشعار سناتی ہوں، جہاں حسن فطرت میں بکھرا نظر آتا ہے، جہاں احساس کا ایک لمحہ صدیوں پر بھاری ہوتا ہے۔

میری زندگی، میری شاعری، میرے گیت — یہ سب میرے جذبات کی رو میں بہتے ہیں۔ میں نہ کسی مخصوص آہنگ کی پابند ہوں، نہ کسی متعین اصول کی قائل۔ میں جب چاندنی رات میں گاتی ہوں، تو میری آواز کی تاثیر سننے والے کے دل کو چھو لیتی ہے۔ یہ حسن ہے! یہ فن ہے!

میری سوچ فن کو انسان کے اندرونی جذبات اور کیفیات کا عکاس سمجھتی ہے۔ یہ کہتی ہے کہ ہر تخلیق کار کو آزادی ہونی چاہیے کہ وہ جو محسوس کرتا ہے، وہی لکھے، وہی گائے، وہی تراشے۔ خواہ وہ جذبات خوشی کے ہوں، غم کے ہوں، یا دیوانگی کے — یہ سب فن کے لائق ہیں۔

تم کہتے ہو کہ ادب کو اصولوں کا پابند ہونا چاہیے؟ میں کہتی ہوں، نہیں! ادب وہ شعلہ ہے جو دل کی آگ سے بھڑکتا ہے، وہ چشمہ ہے جو روح کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہے۔"

یہ کہہ کر بلبل نے ایک دلکش نغمہ چھیڑ دیا۔ اس کی آواز میں سوز اور کرب تھا، جو سننے والوں کے دلوں میں ایک انجانی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ کچھ پرندے محوِ حیرت ہو گئے، کچھ سرگوشیاں کرنے لگے، اور کچھ نے ناگواری سے پر پھڑپھڑائے۔

اتنے میں ایک کوئل، جو اپنی نغمگی اور گہرائی میں مشہور تھی، بلبل کی طرف دیکھ کر بولی:

"اے بلبل! تمہاری باتوں میں جادو تو ہے، مگر کیا محض جذبات ہی سب کچھ ہیں؟ اگر ہر شاعر، ہر مصور، ہر موسیقار صرف اپنے جذبات کی پیروی کرے، تو کیا فن میں کوئی استحکام رہے گا؟ کیا اس کی کوئی سمت ہوگی؟ جذبات بے قابو دریا کی طرح ہیں، اور اگر انہیں کوئی راستہ نہ دیا جائے، تو یہ بربادی کے سوا کچھ نہیں دیتے"!

مور نے اپنی دم سمیٹی اور گویا ہوا:

"بلبل بہن! تم کہتی ہو کہ حسن دل کی کیفیت ہے، مگر کیا حسن کو مکمل انتشار میں چھوڑ دینا ہی واحد راستہ ہے؟ حسن ہمیشہ توازن اور ترتیب کا محتاج ہوتا ہے۔ تم کہتی ہو کہ احساس اور دیوانگی سب کچھ ہے، مگر سوچو! اگر گیت میں کوئی نظم نہ ہو، اگر شاعری میں کوئی ترتیب نہ ہو، تو کیا وہ دیرپا ہو سکتی ہے؟"

چڑیا، جو ہمیشہ معقولیت کی بات کرتی تھی، بولی:

"تمہاری باتیں خوابناک تو ہیں، مگر کیا ادب اور فن محض خواب ہیں؟ کیا ہمیں حقیقت کو نظر انداز کر دینا چاہیے؟ تم کہتی ہو کہ ادب صرف جذبات کی عکاسی کرے، مگر کیا معاشرتی حالات اور حقیقتیں بھی ادب کا حصہ نہیں ہونی چاہئیں؟"

الغرض، وادی میں بلبل پر شدید تنقید ہوئی۔ کچھ پرندے اس کے حامی تھے، کچھ مخالف۔ بلبل نے اپنی گردن فخر سے بلند کی، مگر کہیں نہ کہیں وہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ شاید جذبات کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی ضروری ہوتا ہے۔

بلبل کے نغمے اور اس پر ہونے والی تنقید کے بعد وادی میں چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ اچانک ایک نرم و ملائم آواز سنائی دی۔ ایک فاختہ اپنی جگہ سے اٹھی، اس کے پروں میں ایک ٹھہراؤ تھا، مگر آنکھوں میں ایک عجیب سی تپش۔ وہ دھیرے سے قدم بڑھاتے ہوئے مجلس کے درمیان آئی اور بولی:

"اے اہلِ وادی! تم نے حسن کی قید کی بات سنی، تم نے جذبات کی بے مہار آزادی کی بات بھی سنی، مگر کیا حسن اور

جذبات کا کوئی مقصد نہیں ہونا چاہیے؟ کیا شاعری اور فنون لطیفہ کا کام صرف نغمہ گری اور رنگینی ہے؟ کیا ادب صرف دل بہلانے کا ذریعہ ہے؟ نہیں! میں تمہیں ایک اور نظریے کی دعوت دیتی ہوں۔

میرے نزدیک ادب اور فن وہی معتبر ہے جو سماج کی بہتری میں اپنا کردار ادا کرے۔ ایک شاعر کی آواز صرف محبت کے ترانے کے لیے نہیں، بلکہ مظلوموں کی پکار کے لیے بھی ہونی چاہیے۔ ایک مصور کے رنگ صرف قدرتی حسن کی عکاسی نہ کریں، بلکہ ان ہاتھوں کی سختی بھی دکھائیں جو دن بھر محنت کرتے ہیں۔ ایک کہانی صرف خوابوں میں کھونے کے لیے نہ ہو، بلکہ حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھانے کے لیے لکھی جائے۔

میں نے بستیوں میں فاقہ کش بچوں کو دیکھا ہے، میں نے جنگوں میں اجڑتے ہوئے گھروں کو دیکھا ہے، میں نے ظالموں کو مظلوموں کے خون سے ہاتھ رنگتے دیکھا ہے— اور میں یہ سب دیکھ کر چپ نہیں رہ سکتی! اگر ایک شاعر ان دکھوں پر خاموش رہے، اگر ایک مصور صرف محلات اور حسین وادیوں کی تصویریں بناتا رہے، اگر ایک کہانی کار صرف عشقیہ داستانوں میں کھویا رہے، تو پھر یہ فنونِ لطیفہ کس کام کے؟

میں تمہیں میر، غالب، فیض، ناظم حکمت اور پابلو نرودا کی شاعری یاد دلاتی ہوں، جن کے اشعار میں انقلاب کی صدا تھی، جن کے لفظوں میں محنت کشوں کی زندگی کا درد تھا۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ سچا ادب وہ ہے جو محروموں کی آواز بنے، جو جبر کے خلاف اٹھے، جو انسان کو انسانیت کا سبق دے۔

اے اہلِ وادی! حسن، جذبات اور فن سب اپنی جگہ، مگر جب تک یہ کسی مقصد کے لیے استعمال نہ ہوں، یہ بے معنی ہیں۔ ایک شاعر، ایک فنکار، ایک مصور— یہ سب انسانیت کے خدمت گزار ہیں، نہ کہ محض تفریح کے ذرائع۔ میں تمہیں ترقی پسندیت کی دعوت دیتی ہوں— آؤ، حقیقت کی دنیا میں قدم رکھو، اور اپنے فن کو انسانوں کی بہتری کے لیے وقف کردو۔

یہ کہہ کر فاختہ خاموش ہوئی۔ اس کی باتوں میں سوز تھا، ایک کشش تھی جو کئی پرندوں کے دلوں کو چھوگئی، مگر مجلس میں کئی چہروں پر ناپسندیدگی بھی تھی۔

عقاب، جو معیار کا علمبردار تھا، اپنی بلند شاخ سے نیچے آیا اور قدرے سخت لہجے میں بولا:

"اے فاختہ! تمہاری باتوں میں ایک شدت ہے، مگر کیا فن کا کام صرف انقلاب پیدا کرنا ہے؟ کیا ادب اور شاعری صرف معاشرتی مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے ہیں؟ اگر ہم ہمیشہ ظلم اور ناانصافی کی باتیں کریں گے، اگر ہم ہر وقت

دکھوں کو لکھتے رہیں گے، تو حسنِ تخلیق کہاں جائے گا؟ ادب کا کام صرف آگ لگانا نہیں، بلکہ دلوں کو سکون دینا بھی ہے"!

بلبل، جو حسن کی نمائندہ تھی، نے اپنے نغمے میں درد گھولتے ہوئے کہا:

"اے فاختہ! تم کہتی ہو کہ شاعری صرف مظلوموں کی آواز بنے، مگر کیا شاعری کا کوئی اور مقصد نہیں؟ کیا ایک شاعر کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے خوابوں، اپنی محبتوں اور اپنے جذبات کو الفاظ میں ڈھالے؟ کیا ایک مصور کو یہ آزادی نہیں کہ وہ صرف حسین مناظر کی تصویر کشی کرے؟ تم نے فن کو ایک مقصد دے دیا، مگر کیا فن کو مقصد کی زنجیروں میں قید کر دینا درست ہے؟"

مور نے اپنی دلکش دم پھیلائی اور کچھ تیکھے لہجے میں بولا:

"اے فاختہ! تم حسن کو حقیقت کی دھول میں کیوں لپیٹنا چاہتی ہو؟ حسن محض حقیقت میں نہیں ہوتا، حسن تخیل میں بھی ہوتا ہے، خوابوں میں بھی ہوتا ہے، اور کبھی کبھی حقیقت سے فرار میں بھی ہوتا ہے۔ اگر ہر فنکار صرف مسائل اور محرومیوں کو ہی لکھے، تو پھر حسن کی پرستش کون کرے گا؟"

الغرض، فاختہ پر کئی اعتراضات اٹھائے گئے۔ کچھ پرندے فاختہ کی حمایت میں بولے، کچھ نے اس کی سختی پر ناپسندیدگی ظاہر کی۔ مگر فاختہ نے اپنی جگہ مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے کہا:

"تم جو بھی کہو، میں اپنی راہ پر چلوں گی! میں ان بیکسوں اور بے زبانوں کی آواز بلند کرتی رہوں گی جو خود اپنی بات نہیں کہہ سکتے"!

فاختہ کے الفاظ کی گونج ابھی تک وادی کی فضا میں تھی۔ کچھ پرندے اس کے خیالات سے متاثر نظر آ رہے تھے، کچھ معترض تھے، مگر مجلس کی نگاہیں اب کسی اور کی منتظر تھیں۔ اتنے میں ایک رعب دار آواز گونجی، اور ایک شان دار شاہین اپنے مضبوط پروں کو پھیلائے آگے بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی، لہجے میں گرج، اور انداز میں بلا کا اعتماد۔ وہ بلند جگہ پر جا بیٹھا اور نہایت وقار کے ساتھ بولا:

"اے اہلِ وادی! تم میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا، مگر کیا تم نے کبھی سوچا کہ تمہارے یہ خیالات کس طبقے کے مفاد میں ہیں؟ اے عقاب! تم حسن کو قدیم اصولوں کی کسوٹی پر پرکھتے ہو، مگر وہ اصول آخر بنائے کس نے تھے؟ امیروں نے! تاکہ حسن صرف ان کی میراث رہے! اے بلبل! تم جذبوں اور احساسات کی بات کرتی ہو،

مگر یہ جذبات آخر کس کے ہوتے ہیں؟ صرف ان کے، جنہیں پیٹ بھر کے کھانے کو ملتا ہے! اور اے فاختہ! تم نے ترقی پسندیت کی بات کی، مگر تمہاری سوچ ابھی مکمل نہیں۔ میں تمہیں ایک ایسا نظریہ دیتا ہوں جو دنیا کے تمام استحصالی نظاموں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے، جو انصاف کا حقیقی علم بردار ہے—

یہ وادی، یہ جنگل، یہ سب کچھ، اس پر سب کا برابر حق ہونا چاہیے۔ مگر دیکھو، کون حکمرانی کر رہا ہے؟ وہ جو طاقت ور ہیں! کیا یہ جائز ہے کہ کچھ پرندے سونے کے گھونسلوں میں رہیں اور کچھ دن بھر خوراک کی تلاش میں بھٹکتے پھریں؟ کیا یہ درست ہے کہ محنت کوئی اور کرے اور فائدہ کوئی اور اٹھائے؟

اے اہلِ وادی! اصل مسئلہ طبقاتی کشمکش ہے، اور جب تک یہ کشمکش ختم نہیں ہوگی، حسن، جذبات، ادب، فن— سب بیکار ہیں! آرٹ اور ادب کو صرف حسن یا احساسات کی نہیں، بلکہ سچائی اور مساوات کی خدمت کرنی چاہیے۔ ہر وہ فن جو طبقاتی تفریق کو قائم رکھے، دراصل ایک استحصالی ہتھیار ہے۔ میں تمہیں عظیم فنکاروں کی مثال دیتا ہوں— پابلو نرودا، برٹولٹ بریخت، جارج لوکاچ— جنہوں نے اپنی تحریروں میں مظلوموں کی آواز بلند کی، جن کے الفاظ نے تخت ہلائے، جن کے شعروں نے انقلاب کی چنگاریاں بھڑکائیں۔

یہ بات یاد رکھو، جب تک زمین پر ظالم و مظلوم موجود ہیں، جب تک امیر و غریب کے درمیان دیواریں کھڑی ہیں، جب تک طاقت ور کمزور کو دباتے ہیں، تب تک حقیقی حسن، حقیقی ادب، حقیقی فن وجود میں نہیں آ سکتا! میں کہتا ہوں، پرانے نظاموں کو توڑو! طبقاتی فرق کو مٹا دو! وہ فن جو انقلابی نہ ہو، وہ فن مردہ ہے! وہ ادب جو عوامی جدوجہد کا ساتھ نہ دے، وہ بے معنی ہے**"!

یہ کہہ کر شاہین خاموش ہوا۔ اس کے الفاظ میں آگ تھی، جو کئی پرندوں کے ذہنوں میں بھڑک اٹھی۔ کچھ پرندے پرجوش ہو گئے، کچھ کے چہروں پر ناپسندیدگی کے آثار نمایاں تھے، اور کچھ گہرے تفکر میں چلے گئے۔

سب سے پہلے ایک سفید بگلا، جو ہمیشہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کرتا تھا، آگے بڑھا اور بولا:

"اے شاہین! تمہاری باتوں میں جوش ہے، مگر کیا فن کا کام صرف انقلاب برپا کرنا ہے؟ تم کہتے ہو کہ حسن، جذبات، اور تخیل کی کوئی حیثیت نہیں، مگر کیا انسان صرف جدوجہد کا نام ہے؟ کیا زندگی صرف جنگ ہے؟ کیا وہ فن جو صرف طبقاتی جدوجہد کا پرچار کرے، وہ کبھی اپنی لطافت برقرار رکھ سکتا ہے؟"

عقاب، جو کلاسیکیت کا نمائندہ تھا، تنقیدی انداز میں بولا:

"تم کہتے ہو کہ پرانے اصول توڑ دو، ہر چیز کو مٹا دو، مگر کیا نیا نظام صرف توڑنے سے بنتا ہے؟ جو ادب صرف اشتعال پیدا کرے، جو فن صرف نعرے بازی بن جائے، کیا وہ سدا قائم رہ سکتا ہے؟ تاریخ نے ہمیں دکھایا ہے کہ جن تحریکوں نے فن کو محض انقلاب کے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا، وہ جلد زوال پذیر ہو گئیں"!

مور نے اپنی رنگین دم پھیلائی اور ہلکے طنزیہ انداز میں کہا:

"شاہین بھائی! تمہاری تقریر میں آگ تو ہے، مگر کیا حسن، آرٹ، اور فن صرف جدوجہد اور انقلاب کے لیے ہیں؟ اگر سب کچھ صرف طبقاتی کشمکش میں جھونک دیا جائے، تو وہ تخلیقی حسن کہاں جائے گا جسے دیکھ کر دل سکون پاتے ہیں؟ اگر ہر فنکار صرف مظلوموں کی کہانیاں لکھنے لگے، تو خوابوں کی دنیا کا کیا ہوگا؟"

الغرض شاہین پر شدید تنقید کی گئی۔ کچھ پرندے اس کے حامی تھے، کچھ مخالف۔ شاہین نے اپنے پر جھاڑے اور پر عزم لہجے میں بولا:

"تم جو بھی کہو، میں اپنے نظریے پر قائم رہوں گا! میں ان کے حق میں بولتا رہوں گا جن کی آوازیں دبا دی گئی ہیں، میں ان کے لیے لکھتا رہوں گا جنہیں کچل دیا گیا ہے"!

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ وادی میں ایک بار پھر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کچھ پرندے شاہین کے خیالات پر غور کر رہے تھے، کچھ بے زاری سے سر جھٹک رہے تھے، اور کچھ منتظر تھے کہ اب کون بولے گا۔

جب شاہین کے نظریات کی بحث اپنے اختتام کو پہنچی تو مجلس میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ہر کوئی اپنی سوچ میں غرق نظر آ رہا تھا۔ اتنے میں ایک گہری، پراسرار آواز گونجی، جیسے کہیں دور جنگل کے کسی تاریک گوشے سے آ رہی ہو۔ سب نے چونک کر دیکھا — یہ ایک بڑا، دانا الو تھا جو اپنی شاخ پر بیٹھا تھا، اس کی آنکھیں گہرے تفکر سے چمک رہی تھیں، اور چہرے پر ایک غیر متزلزل سکون تھا۔

اس نے اپنی چونچ صاف کی، پروں کو ذرا درست کیا، اور سنجیدہ لہجے میں بولا:

"اے اہلِ وادی! تم میں سے ہر ایک نے اپنی کہانی سنائی، مگر تم سب ایک بڑی غلطی کر رہے ہو۔ تم حسن کی قید میں ہو، تم جذبوں کی موج میں بہے جا رہے ہو، تم انقلاب کی دہائی دے رہے ہو — مگر کسی نے یہ نہیں سوچا کہ ان سب چیزوں کی اصل حقیقت کیا ہے؟ میں تمہیں وہ نظریہ دوں گا جو ہر چیز کی جڑ کو سمجھنے کی دعوت دیتا ہے —

میری سوچ یہ کہتی ہے کہ کسی بھی چیز کا مطلب اس کے اندر موجود نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس کے سیاق وسباق اور اس کے

نظام سے جُڑا ہوتا ہے۔ تم لوگ جو حسن، جذبات، ترقی، اور انقلاب کی باتیں کر رہے ہو، کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ سب معانی کہاں سے آتے ہیں؟ یہ سب محض علامات ہیں، جو ایک بڑے ساختی نظام کا حصہ ہیں۔

ذرا سوچو، حسن کوئی مستقل حقیقت نہیں ہے، بلکہ یہ سماج کے بنائے گئے اصولوں کا ایک حصہ ہے! جو تمہیں خوبصورت لگتا ہے، وہ کسی اور کو بدصورت لگ سکتا ہے، کیونکہ حسن کا مطلب ایک نظام کے تحت متعین ہوتا ہے۔

تم سب جذبات اور تخیل کی بات کرتے ہو، مگر کیا یہ سب تمہاری ذاتی سوچ ہوتی ہے؟ نہیں! یہ سب زبان، ثقافت، اور سماجی ڈھانچے کے تحت بنتے ہیں۔ شاعری، نثر، مصوری — یہ سب ساختی نظام کے پرزے ہیں۔ کوئی فنکار آزاد نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ ایک زبان، ایک معاشرتی نظام، اور ایک ساخت کے اندر رہ کر ہی تخلیق کرتا ہے۔

شاہین بھائی! تم انقلاب کی بات کرتے ہو، مگر کیا انقلاب کی زبان خود ایک نظام کا حصہ نہیں؟ تم نعرے بلند کرتے ہو، مگر وہ نعرے خود ایک مخصوص ساخت کے اندر رہ کر بنائے گئے ہیں، وہ کسی بھی دوسری زبان میں ترجمہ ہوں تو اپنا اثر کھو سکتے ہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ کسی بھی فن کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس کے ظاہری الفاظ اور جذبات سے ہٹ کر، اس کے پس پردہ کام کرنے والے نظام کو دیکھنا ہوگا۔ تم جو بھی نظریہ اپناتے ہو، وہ خود ایک بڑے نظام کا حصہ ہے، اور جب تک تم اس نظام کو نہیں سمجھو گے، تمہاری ہر بحث نامکمل رہے گی"!

یہ کہہ کر الو نے اپنی بڑی آنکھیں جھپکائیں، اور خاموش ہو گیا۔ مجلس پر ایک گہری سوچ طاری ہو گئی۔

بلبل نے پہلے پہل حیرت سے اپنی گردن مٹکائی، پھر نرمی سے بولی:

"اے دانا الو! تم کہتے ہو کہ حسن ایک ساختی نظام کا حصہ ہے، مگر کیا حسن کو ایک نظام کی قید میں باندھ دینا خود ایک ناانصافی نہیں؟ میں جو گاتی ہوں، جو محسوس کرتی ہوں، کیا وہ محض سماجی ڈھانچوں کی پیداوار ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر میرا اپنا وجود کہاں گیا؟ میرے جذبات کا کیا بنا؟"

شاہین، جو فن میں مزدوروں کی نمائندگی کا حامی تھا، ذرا سخت لہجے میں بولا:

"تمہاری باتیں دلچسپ ہیں، مگر کہیں نہ کہیں وہ حقیقت سے کٹی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ کیا تم واقعی یہ کہہ رہے ہو کہ انقلابی تحریریں محض ایک نظام کا نتیجہ ہیں؟ نہیں! انقلاب انسان کی بقا کی جنگ ہے، یہ صرف علامات کا کھیل نہیں! تم ہر چیز کو ساختوں میں قید کر رہے ہو، مگر کیا عملی دنیا میں واقعی سب کچھ صرف ساختی نظاموں کے تابع ہوتا ہے؟"

مور، جو جمالیات اور حسن کا پرستار تھا، طنزیہ انداز میں مسکرایا اور بولا:

"اے الو بھائی! تمہارے مطابق سب کچھ ساختی نظام کا حصہ ہے، مگر پھر فن اور تخلیق کی انفرادیت کہاں گئی؟ تم کہتے ہو کہ فنکار آزاد نہیں، مگر کیا ہم واقعی محض زبان اور ثقافت کے بنائے ہوئے پرزے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر نئی تخلیقات کیسے جنم لیتی ہیں؟ تمہاری باتیں فلسفیانہ ہیں، مگر حقیقت میں فنکار ایک آزاد روح ہوتا ہے"!

مجلس میں مختلف آراء اٹھ رہی تھیں۔ کچھ پرندے الو کی حکمت سے متاثر نظر آ رہے تھے، کچھ کو اس کی باتوں میں الجھاؤ محسوس ہو رہا تھا۔ الو نے اپنی بڑی آنکھوں سے سب کی طرف دیکھا، اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا:

"تم لوگ سمجھو یا نہ سمجھو، مگر یاد رکھو کہ ہر چیز ایک نظام کے تحت کام کر رہی ہے۔ جب تک تم اس نظام کو نہیں سمجھو گے، تم حقیقت کے قریب نہیں پہنچ سکو گے"!

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ مجلس میں ایک بار پھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کچھ پرندے اس کے خیالات پر غور کر رہے تھے، کچھ بے زاری سے سر جھٹک رہے تھے، اور کچھ منتظر تھے کہ اب کون بولے گا۔

الو کے نظریات پر ہونے والی بحث نے مجلس میں فکری ہلچل مچا دی تھی، مگر گفتگو کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اتنے میں وہی دانا الو دوبارہ اپنی شاخ پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے کچھ لمحے خاموش رہا، جیسے کسی گہرے خیال میں کھو گیا ہو۔

پھر اچانک اس نے آنکھیں کھولیں، جیسے کسی خواب سے جاگا ہو، اور ایک گہری، مگر قدرے مدھم آواز میں بولا:

"اے اہلِ وادی! میں نے تمہارے درمیان فن کی حقیقت پر گفتگو کی، مگر میں جانتا ہوں کہ ہر نظریہ اپنے اندر ایک اور پرت رکھتا ہے۔ تم سب ظاہری الفاظ پر الجھ رہے ہو، مگر میں تمہیں ایک اور حقیقت دکھاؤں گا، جو تمہاری روحوں میں پنہاں ہے۔ میں تمہیں اندر کی دنیا میں لے چلتا ہوں۔"

"فن، ادب، اور شاعری کا اصل سرچشمہ کیا ہے؟ یہ محض ایک سماجی ڈھانچے کی پیداوار نہیں، بلکہ اس کے پیچھے ایک پوشیدہ دنیا کام کر رہی ہے، وہ دنیا جو ہماری شعوری اور لاشعوری کیفیات سے جُڑی ہے۔ فنکار جو تخلیق کرتا ہے، وہ دراصل اس کے ذہن کے گہرے لاشعور میں پلنے والے خیالات، خواہشات، اور خوف کی عکاسی ہوتی ہے۔"

"اے بلبل! جب تُو چہکتی ہے، تو یہ محض لفظوں اور راگوں کا کھیل نہیں، یہ تیری لاشعوری کیفیت کا اظہار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تیرا ہر نغمہ کسی دبے ہوئے خوف، کسی انجانی خواہش، یا کسی ماضی کے تجربے کی بازگشت ہو۔"

"اے مور! تیرا رنگین پر پھیلانا، تیرا ناز و انداز، تیری اداکاری — یہ سب ایک گہری نفسیاتی جڑ رکھتے ہیں۔ شاید تُو اپنی

خوبصورتی کو خود تسلیم کروانے کی کوشش میں ہے، شاید تجھے کسی انجانے احساسِ کمتری نے گھیر رکھا ہے، اور تُو اپنی زینت کو اپنی پہچان بنانے پر مجبور ہے۔"

"اے شاہین! تیرا انقلاب کی بات کرنا، تیرے جوشیلے الفاظ — یہ سب کہیں نہ کہیں تیرے اپنے باطن میں پلنے والے کسی اندرونی اضطراب کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ شاید تُو نے کسی وقت بے بسی کو محسوس کیا ہو، شاید تُو نے اپنی طاقت کا امتحان لینے کی کوشش کی ہو۔ جو تم سب سوچتے ہو، وہ تمہاری لاشعوری ذہنیت کی تخلیق ہے"!

"میری سوچ یہ بتاتی ہے کہ ہر ادبی تخلیق ایک علامت ہے، ایک ایسا خواب ہے جس کی جڑیں تخلیق کار کے ذہنی اضطراب، اس کے ماضی، اس کے خوف، اس کی ناآسودہ خواہشات میں چھپی ہوتی ہیں۔ اگر ہم کسی بھی فن پارے کو سمجھنا چاہتے ہیں، تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے پیچھے کون سے لاشعوری عوامل کارفرما ہیں۔"

یہ کہہ کر الو خاموش ہو گیا۔ مجلس میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ پرندے جیسے کسی خواب میں کھو گئے تھے، کچھ کی آنکھوں میں سوالات تھے، اور کچھ الجھن میں پڑ گئے تھے۔

بلبل نے سب سے پہلے حیرانی سے گردن مٹکائی اور بولی:

"اے الو! کیا تُو یہ کہہ رہا ہے کہ جو میں گاتی ہوں، وہ محض میرے لاشعوری خیالات کا نتیجہ ہے؟ نہیں! میں گاتی ہوں کیونکہ یہ میری روح کی پکار ہے، میرے احساسات کی سچائی ہے! اگر ہر چیز محض کسی دبے ہوئے خوف یا کسی انجانی خواہش کا عکس ہے، تو پھر سچے جذبے اور خالص احساسات کا کیا ہوگا؟"

مور نے اپنی گردن خم کی، اپنی دم کو پھیلایا، اور قدرے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا:

"اے دانا الو! تُو نے جو خوابوں کی بات کی، وہ شاید تیرے لیے درست ہو، مگر حقیقت میں فن صرف خوابوں اور نفسیاتی علامتوں کا مجموعہ نہیں۔ میں اگر اپنی خوبصورتی دکھاتا ہوں، تو اس کا مطلب صرف کسی چھپی ہوئی خواہش کا اظہار نہیں، بلکہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں واقعی خوبصورتی کو سراہنے والا ہوں؟ حسن، فن، اور جمالیات کو محض کسی لاشعوری اضطراب سے جوڑ دینا کیا زیادتی نہیں؟"

شاہین ذرا برہمی سے بولا:

"اے الو! تیرا فلسفہ شاید تخلیق کی گہرائی کو بیان کرتا ہو، مگر یہ حقیقت سے دور ہے۔ میں انقلاب کی بات کرتا ہوں، میں مظلوموں کی آواز بلند کرتا ہوں، اور تُو کہتا ہے کہ یہ سب میرے ذہن کے کسی اندرونی خوف یا ماضی کے کسی تجربے کا

نتیجہ ہے؟ نہیں! جدوجہد حقیقت ہے، شعوری فیصلہ ہے! تیری یہ سوچ ہمیں محض خود پرستی میں مبتلا کر دے گی، اور سماجی حقیقتوں سے دور کر دے گی"!

پہلے الو نے سر جھکایا، جیسے اپنی ہی باتوں میں کھو گیا ہو، اور پھر مدھم لہجے میں بولا:

"شاید تم سب درست کہہ رہے ہو، شاید میں بھی غلط نہیں۔ مگر یہ مت بھولو کہ ہر تخلیق کار کے لاشعور میں ایک چھپا ہوا جہان ہوتا ہے، اور جب تک تم اس جہان کو نہ سمجھو، تم کسی بھی فن کو مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتے"!

یہ کہہ کر وہ پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ وادی میں پھر سے سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کچھ پرندے نفسیاتیت کے خیالات پر غور کر رہے تھے، کچھ بےزاری سے سر جھٹک رہے تھے، اور کچھ منتظر تھے کہ اب کون بولے گا۔

وادی میں ایک گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ ہر پرندہ اپنے اپنے خیالات میں گم تھا۔ نظریات کی جنگ نے وادی کی فضا کو بوجھل کر دیا تھا۔ اچانک، ایک کرخت مگر بےباک آواز گونجی:

"خوب کہا، خوب کہا! پرندوں کی اس دانشورانہ مجلس میں کیا باتیں ہو رہی ہیں! کوئی حسن کا دیوانہ ہے، کوئی انقلاب کا نقیب، کوئی نفسیات کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہے، تو کوئی سماجی انصاف کے خواب دیکھ رہا ہے۔ مگر کسی نے سچائی کی طرف دیکھا ہی نہیں"!

یہ آواز کالی، بدہیئت، مگر بے حد ذہین کوے کی تھی، جو ہمیشہ خود کو سب سے برتر سمجھتا تھا۔ وہ ایک شاخ پر اکڑ کر بیٹھا اور اپنی چمکدار کالی آنکھوں سے سب پرندوں کو گھورتے ہوئے بولا:

"اے مور! تُو کہتا ہے حسن ہی سب کچھ ہے، مگر کیا حسن کا کوئی معیار ہے؟ تُو اپنے پروں کو دیکھ کر نازاں ہے، مگر کیا تُو نے کبھی مجھے غور سے دیکھا ہے؟ میں بھی تو کالا ہوں، گہرا، چمکدار کالا، جیسے رات کی گہرائی، جیسے بادلوں کا بوجھل سایہ، جیسے چمکتے کوئلے کی روشنی۔ اگر میں اپنے حسن کا قائل ہوں، تو تُو مجھے کیسے بدصورت کہہ سکتا ہے؟"

پھر وہ بلبل کی طرف مڑا اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا:

"اے نغمہ سرا! تُو اپنی آواز پر اتراتی ہے، مگر کیا تُو نے کبھی میرے نغمے سنے ہیں؟ میرے قبیلے کے نغمے تیز، بےباک اور فطرت سے قریب ہیں۔ میں بھی گاتا ہوں، میرا بھی راگ ہے، میرا بھی سُر ہے۔ اگر تُو اپنے گیتوں کو موسیقی مانتی ہے، تو پھر میرے نغمے کیوں شور قرار دیے جاتے ہیں؟ یہ سب سماعت کی بات ہے، جو پسند کرے، وہی میٹھا ہے، جو ناپسند کرے، وہی شور"!

پھر وہ شاہین کی طرف مڑا اور طنزیہ انداز میں بولا:

"اے انقلاب کے پیامبر! تُو طاقت کی بات کرتا ہے، میں بھی تو طاقتور ہوں! میں اپنے زورِ بازو پر جیتا ہوں، میں جو چاہوں کھاؤں، جہاں چاہوں رہوں، میں کسی کے اصولوں کا پابند نہیں! تُو نے کہا کہ طاقت سب کچھ ہے، تو میں کہتا ہوں کہ پھر سب سے طاقتور میں ہوں، کیونکہ میں ہر حال میں جیتا ہوں، حالات جیسے بھی ہوں، میں اپنی جگہ بناتا ہوں"!

پھر وہ فاختہ کی طرف دیکھ کر زور سے ہنسا اور بولا:

"اور تُو، اے سکون کی پیامبر! تُو کہتی ہے ادب اور فن کا مقصد عام پرندوں کی خدمت ہے؟ مگر مجھے تو یہ فن محض ایک کھیل لگتا ہے! کیا بھوکے کو روٹی دینے سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ اُسے غزلیں سنائی جائیں؟ تُو کہتی ہے سماج بدلنے کی ضرورت ہے، مگر کیا یہ سماج حقیقت میں بدل سکتا ہے؟ ہر دور میں کچھ طاقتور ہوں گے، کچھ کمزور۔ تُو چاہے جتنی کوشش کر لے، تیرے خواب بس خواب ہی رہیں گے"!

کوے نے اپنے پر جھاڑے، اپنی چونچ اوپر اٹھائی اور بلند آواز میں بولا:

"میں کہتا ہوں کہ حسن، آواز، طاقت، ادب، انقلاب، سب فریب ہیں! جو خوبصورت لگے، وہی خوبصورت ہے! جو سریلا محسوس ہو، وہی سریلا ہے! میں خود کو سب سے حسین سمجھتا ہوں، تو پھر میں حسین ہوں! میں اپنی آواز کو سریلا سمجھتا ہوں، تو پھر میری آواز سب سے سریلی ہے! کسی کو قبول ہو یا نہ ہو، مگر حقیقت یہی ہے کہ حسن کا کوئی معیار نہیں، کوئی اصول نہیں، کوئی ضابطہ نہیں! جو نظر سے دیکھو گے، وہی حقیقت ہوگی! جو دل سے دیکھو گے، وہی سچ ہوگا! اور میں، میں سب سے حسین ہوں، سب سے منفرد ہوں"!

یہ کہہ کر کوا اکڑ کر بیٹھ گیا۔ مجلس میں خاموشی چھا گئی۔ کچھ پرندے حیرت میں پڑ گئے، کچھ کو اس کی باتوں میں حقیقت نظر آئی، اور کچھ اسے محض ایک دیوانے کا خبط سمجھنے لگے۔ مگر جو بھی تھا، آج اس وادی میں ایک نیا نظریہ سامنے آیا تھا — نظریہ انفرادیت، نظریہ خود مختاری، نظریہ اپنی حقیقت خود بنانے کا!

پچھتاوہ

وسطی پنجاب کے ہرے بھرے کھیتوں میں، جہاں دن کو سورج کی سنہری روشنی لہلہاتے کھیتوں پر جھلملاتی اور رات کو چاندنی نیم خوابیدہ گاؤں کے آنگنوں میں پھیل جاتی، ایک شاندار حویلی تھی۔ یہ چودھری نذیر کی حویلی تھی، جو اپنی شان وشوکت میں گاؤں کی ہر دوسری عمارت سے نمایاں تھی۔ اونچے دروازے، وسیع صحن، کندہ شدہ لکڑی کے ستون، اور دیواروں پر لگے پرانے زمانے کے فانوس، جو ہر رات حویلی کو روشنی میں نہلا دیتے تھے۔ حویلی کے گرد لمبی دیوار تھی، اور اس کے باہر بیٹھک جہاں گاؤں کے بڑے بوڑھے شام کے وقت حقہ گُڑگُڑاتے اور سیاست پر بحث کرتے۔

چودھری نذیر گاؤں کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ چوڑے چکلے بدن، مونچھوں کو تاؤ دیے رکھنا اس کی شان تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی سختی تھی جو کمزوردلوں کو کانپنے پر مجبور کر دیتی۔ جب وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر کھیتوں کا چکر لگاتا تو مزدوروں کے ہاتھ خود بخود تیزی سے چلنے لگتے، جیسے کسی نادیدہ خوف نے انہیں جکڑ لیا ہو۔ اس کے لباس سے اس کی امارت جھلکتی تھی۔ سفید کڑک دار کُرتا، قیمتی کھسہ، کلائی پر سونے کی گھڑی اور انگلی میں بڑی نیلم کی انگوٹھی، جسے وہ کبھی کبھی غور سے دیکھتا اور مسکراتا۔

چودھری کی حویلی میں کئی ملازم کام کرتے تھے، مگر ان میں سب سے زیادہ محنتی اور ایماندار نوکر اللہ دتہ تھا۔ وہ گاؤں کا ایک غریب مگر غیرت مند شخص تھا۔ پتلا دبلا جسم، سانولی رنگت، چہرے پر ہمیشہ محنت کی تھکن مگر آنکھوں میں عزم کی چمک۔ اس کے دن کا آغاز حویلی کی صفائی سے ہوتا، پھر مویشیوں کو چارہ ڈالنا، کھیتوں میں کام کرنا، چودھری کے مہمانوں کے لیے چائے پانی کا بندوبست کرنا، اور رات کو دیر تک مختلف کاموں میں مصروف رہنا۔ اسے جو تنخواہ ملتی، وہ سیدھا اپنی بیمار ماں کے علاج اور چھوٹے بہن بھائیوں کی ضروریات پر خرچ کر دیتا۔ وہ چپ چاپ، کم گو مگر انتہائی

وفادار تھا۔

حویلی میں اس کی محنت کی قدر کی جاتی تھی، مگر یہ قدر محض زبانی تھی۔ چودھری کے بیٹے اکثر اس کی تعریف کرتے، مگر چودھری نذیر خود اسے صرف ایک نوکر سمجھتا تھا، ایک ایسا آدمی جس کا ہونا ضروری تو تھا، مگر جس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اللہ دتہ کو ان باتوں کی پرواہ نہیں تھی۔ اس کی ماں اسے ہمیشہ کہتی، "بیٹا، مزدوری میں برکت ہے، ایمانداری سے کام کرو تو اللہ عزت دیتا ہے۔" وہ یہ الفاظ یاد رکھتا اور ہر دن محنت سے کام کرتا۔

ایک دن اللہ دتہ چودھری نذیر کے کمرے کی صفائی کر رہا تھا۔ یہ کمرہ دوسرے کمروں سے مختلف تھا، کیونکہ یہاں چودھری کی پسندیدہ چیزیں رکھی گئی تھیں۔ لکڑی کی ایک بڑی الماری میں قیمتی کتابیں، شیشے کی بنی ایک نازک سی میز، اور دیوار پر چمڑے کے فریم میں بند بندوقیں۔ صفائی کے دوران، اللہ دتہ کے ہاتھ سے اچانک میز پر رکھا قیمتی شیشہ گر کر ٹوٹ گیا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ چودھری نذیر نے فوراً باہر آ کر دیکھا، اور جیسے ہی منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آیا، اس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔

"حرام خور! یہ تم نے کیا کیا؟" چودھری نذیر کی آواز بجلی کی طرح کڑکی۔

اللہ دتہ نے کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑے، "چودھری صاحب، مجھ سے غلطی ہو گئی، میں آئندہ احتیاط کروں گا۔"

"غلطی؟ تمہاری یہ اوقات کہ تم میرے قیمتی سامان کو توڑو؟" چودھری نے غصے میں آ کر ایک تھپڑ جڑ دیا۔

اسی وقت، چودھری کے ملازموں اور کچھ دیہاتیوں نے بھی یہ منظر دیکھ لیا۔ چودھری نے اللہ دتہ کو حویلی کے بڑے صحن میں کھڑا کر دیا اور گاؤں کے لوگوں کو بلا لیا۔

"دیکھو، یہ ہے تمہارا ایماندار مزدور! جسے میں نے اپنے نمک پر پالا، اور آج یہ میرے گھر میں توڑ پھوڑ کر رہا ہے"!

لوگ خاموش تھے، کچھ ہمدردی سے اللہ دتہ کو دیکھ رہے تھے، مگر کسی میں ہمت نہ تھی کہ کچھ کہہ سکے۔ اللہ دتہ نے سر جھکا لیا، اس کے دل میں جیسے کوئی شے ٹوٹ گئی تھی۔ وہ کچھ کہہ سکتا تھا، مگر جانتا تھا کہ طاقت ہمیشہ ظالم کے پاس ہوتی ہے۔ وہ خاموش کھڑا رہا، جب تک کہ چودھری نے اسے جھڑک کر کام پر واپس نہ بھیج دیا۔

رات کا وقت تھا۔ گاؤں کے کچے راستوں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی، دور کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ چاند کی زرد روشنی نیم تاریک گلیوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اللہ دتہ کام ختم کر کے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے قدم بوجھل تھے، جیسے دل کی بے بسی نے جسم پر بھی بوجھ ڈال دیا ہو۔ وہ چوراہے پر آ کر رُکا، جہاں چند گاؤں والے بیٹھے

آپس میں باتیں کر رہے تھے۔اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، جیسے کسی سے سوال کر رہا ہو، پھر ایک آہ بھری اور دھیمے مگر مضبوط لہجے میں کہا:

"خدا کرے، اس کے گھر کو آگ لگ جائے"!

یہ جملہ سن کر بیٹھے ہوئے لوگ چونک گئے۔ کچھ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا، کچھ کے چہروں پر خوف کے آثار ابھرے۔کوئی کچھ نہ بولا، لیکن فضا میں ایک عجیب سی گونج باقی رہ گئی۔اللہ دتہ یہ کہہ کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔اس کے دل میں کوئی شدید انتقام نہ تھا، بس دل کی چوٹ نے زبان سے ایک دعا کے بجائے بددعا نکلوا دی تھی۔مگر تقدیر کے کھیل نرالے ہوتے ہیں، کچھ الفاظ ہواؤں میں بکھر کر مٹ جاتے ہیں، مگر کچھ کسی نہ کسی حقیقت کا لباس پہن کر زمین پر اتر آتے ہیں۔

چند دن اسی خاموشی میں گزر گئے۔ گاؤں کی زندگی معمول کے مطابق رواں تھی، چودھری نذیر کی حویلی میں ویسا ہی رعب و دبدبہ قائم تھا۔مگر پھر ایک رات وہ واقعہ ہوا، جس نے پورے گاؤں کو ہلا کر رکھ دیا۔

یہ گہری رات کا وقت تھا، جب چودھری نذیر کے سب سے چھوٹے نوکر نے چیخ کر حویلی کے صحن میں اعلان کیا:

" آگ! آگ لگ گئی"!

یہ آواز بجلی کی طرح پورے حویلی میں دوڑ گئی۔ایک لمحے میں سارے نوکر جاگ گئے، چودھری نذیر خود بھاگ کر باہر آیا۔اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔" کہاں آگ لگی ہے؟"اس نے چیخ کر پوچھا۔

"جناب! حویلی کے پچھلے حصے میں"! کسی نے جواب دیا۔

چودھری نذیر نے ایک نظر آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر ڈالی۔وہ انگارے کی مانند دہک رہے تھے، جیسے انتقام کی لپٹیں تھیں جو آسمان تک جا رہی تھیں۔آگ نے چند لمحوں میں لکڑی کی چھت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اور وہاں سے بھڑک کر قیمتی پردوں تک جا پہنچی۔ ہر چیز جلتی جا رہی تھی، جیسے ماضی کے سارے گناہ راکھ میں تبدیل ہونے لگے ہوں۔

"پانی! پانی لاؤ"! چودھری گرجا۔

نوکر پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر لانے لگے، مگر آگ کی شدت کے آگے وہ قطرہ معلوم ہوتی تھیں۔گاؤں کے لوگ بھی شور سن کر وہاں پہنچ گئے۔کوئی مٹی ڈال رہا تھا، کوئی گیلی چادریں دیواروں پر پھینک رہا تھا، مگر شعلے ہر کوشش کو بے اثر کر

رہے تھے۔ چودھری کا سب سے بڑا نقصان وہ قیمتی کمرہ تھا، جہاں اس کی سب سے پسندیدہ چیزیں رکھی گئی تھیں۔ وہ کمرہ دھوئیں اور آگ میں لپٹا ہوا تھا۔

چودھری خود پانی پھینکنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر جب اس نے دیکھا کہ آگ بے قابو ہو چکی ہے، تو اس کے چہرے پر بے بسی پھیل گئی۔

"یا اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے کانپتے ہوئے کہا۔

ادھر گاؤں کے کچھ بزرگ سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے:

"یہ آگ یونہی نہیں لگی۔ اللہ دتہ نے جو کہا تھا، وہی ہو رہا ہے۔"

"ہاں، مگر وہ تو بے چارہ ایک غریب مزدور ہے، اس کے الفاظ میں اتنی طاقت کہاں؟"

"کبھی کبھی مظلوم کی زبان پر آنے والے الفاظ بھی تقدیر بن جاتے ہیں"!

یہ سرگوشیاں آہستہ آہستہ ایک پھیلتی ہوئی چنگاری کی مانند لوگوں میں سرایت کرنے لگیں۔ کچھ لوگ حیرت میں تھے، کچھ خوفزدہ، اور کچھ کو لگا جیسے اس آگ کے پیچھے واقعی کسی غیبی ہاتھ کا اثر تھا۔

"مزید پانی لاؤ"! چودھری نے چیخ کر کہا، مگر پانی ختم ہوتا جا رہا تھا، لوگ تھک چکے تھے، اور آگ جیسے کسی اور ہی قانون کے تحت جل رہی تھی۔

بالآخر، کئی گھنٹوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد آگ بجھنے لگی۔ دیواروں پر صرف سیاہ دھواں رہ گیا تھا، چھت کا کچھ حصہ گر چکا تھا، اور لکڑی کے فرنیچر راکھ میں تبدیل ہو چکے تھے۔ چودھری نذیر حویلی کے جلے ہوئے صحن میں کھڑا تھا، اس کی نظریں ویرانی کو تک رہی تھیں۔

وہ دھیرے دھیرے اپنے مخصوص کمرے کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی دروازہ کھولا، ایک شدید دھواں اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ اندر کچھ بھی باقی نہ بچا تھا، بس دیواروں پر جلے ہوئے نشانات تھے، اور فرش پر بکھری ہوئی راکھ۔ وہ حیرت زدہ کھڑا تھا، جیسے یقین نہ آ رہا ہو کہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔

چند لمحوں کے بعد، چودھری کے چہرے پر ایک سختی در آئی۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں، اور آنکھوں میں ایک تیز چمک ابھری۔

"یہ آگ اتفاق نہیں ہو سکتی"... اس نے آہستہ سے کہا۔

اس کی نظروں کے سامنے اللہ دتہ کا چہرہ آ گیا۔ وہ لمحہ یاد آیا جب اس نے بد دعا دی تھی، وہ جملے جو اس نے کہے تھے، اور اس وقت کے لوگوں کے تاثرات۔

"یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے"! چودھری نے ایک بار پھر چیخ کر کہا۔

نوکر اور گاؤں والے سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"اللہ دتہ! وہ کمینہ، اسی نے بد دعا دی تھی! اور دیکھو، میرے گھر کے ساتھ کیا ہوا"! اسی نے لگائی ہے آگ!

" مگر چودھری صاحب، آگ تو کسی اور وجہ سے بھی لگ سکتی ہے، ہوسکتا ہے "...ایک شخص نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"چپ رہو! میں جانتا ہوں، یہ وہی مزدور ہے، جو میرے گھر کو جلانے کا خواب دیکھ رہا تھا"! چودھری نے زور سے کہا۔

اب اس کی آنکھوں میں صرف غصہ تھا۔ اس کا دماغ کسی منطق کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کے لیے ایک ہی مجرم تھا، اور وہ تھا اللہ دتہ۔

گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، کوئی کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ سب جانتے تھے کہ چودھری کا غصہ اندھا ہوتا ہے، اور جب وہ کسی کو قصوروار ٹھہرا دے، تو پھر کوئی دلیل نہیں چلتی۔۔۔۔۔۔

اللہ دتہ جیل میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ غریب بے چارہ تو کسی کو بد دعا بھی نہیں دے سکتا۔ اسے اس بات کا پچھتاوہ تھا کہ اس نے بد دعا کیوں دی۔

عجیب جانور

کہیں کائنات کی وسعتوں میں، ایک ایسا سیارہ آباد تھا جہاں حیوانات کی ایک وسیع سلطنت قائم تھی۔ یہ کوئی عام سیارہ نہ تھا، بلکہ ایک ایسا خطہ زمین تھا جہاں ممالیہ، پرندے، رینگنے والے جاندار، کیڑے مکوڑے اور آبی حیات سبھی ایک ساتھ بستے تھے۔ یہاں نہ کوئی کم تر تھا اور نہ ہی کسی ایک مخلوق کو دوسری پر کوئی فوقیت حاصل تھی۔۔۔ کم از کم بظاہر یہی محسوس ہوتا تھا۔

یہاں کے جنگل، میدان، پہاڑ، دریا اور سمندر ہر مخلوق کے لیے یکساں تھے۔ شیروں کی گرجتی دھاڑوں کے درمیان ہاتھیوں کی دانشمندانہ خاموشی، بھیڑیوں کی اجتماعی دوڑ، گھوڑوں کی سبک روی، کتوں کی وفاداری اور بلیوں کی چالاکی ہر طرف نظر آتی۔ آسمان میں عقاب اونچی اڑان بھرتے تو الو درختوں کے سائے میں غور و فکر کرتے۔ سانپ اور مگرمچھ چپ چاپ گھات لگاتے، جبکہ چیونٹیاں اور مکھیاں مصروفِ عمل رہتیں۔ سمندروں میں ڈولفن کھیلتی، شارک شکاری کی طرح گھومتی، اور ہشت پا کسی چٹان کے پیچھے چھپ کر اپنی حکمت عملی تیار کرتا۔

یہ سیارہ ایک توازن کے ساتھ چل رہا تھا، یہاں تک کہ ایک دن، ایک بحث نے اس سکون کو درہم برہم کر دیا۔ ہر جانور نے محسوس کیا کہ وہ سب سے افضل ہے، سب سے برتر ہے، سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ لیکن کس میں سب سے زیادہ خوبیاں تھیں؟ کس میں سب سے زیادہ خامیاں؟ یہ طے ہونا ابھی باقی تھا۔

یہ بحث ایک عام دن کے آغاز میں ہوئی، جب تمام جانور اپنے اپنے معمولات میں مصروف تھے۔ مگر ایک جگہ، جنگل کے بیچوں بیچ ایک وسیع میدان میں، مختلف جانور جمع ہونا شروع ہوئے۔ شیر ایک بڑے پتھر پر بیٹھا اپنی دھاڑ کے ساتھ اپنے جاہ و جلال کا اظہار کر رہا تھا، جبکہ ہاتھی اپنی گہری آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ عقاب بلندی پر بیٹھا نیچے جھانک

رہا تھا، اور بھیڑیا اپنی جماعت کے ساتھ قریب کھڑا سب کی حرکات کو پرکھ رہا تھا۔
پہلے پہل تو محض ہلکی پھلکی گفتگو رہی، لیکن جلد ہی ہر جانور اپنی بڑائی ثابت کرنے پر تل گیا۔ کوئی اپنی طاقت کا ذکر کر رہا تھا، کوئی اپنی دانشمندی کا، کوئی اپنی رفتار اور کوئی اپنی حکمتِ عملی کا۔
اچانک، شیر نے دھاڑ کر کہا:
"یہ بحث ختم کرو! سب جانتے ہیں کہ جنگل کا بادشاہ میں ہوں۔ میری قیادت، بہادری، اور حکمت کسی اور میں نہیں۔"
مگر اس سے پہلے کہ شیر اپنی بڑائی مکمل کر پاتا، بھیڑیا آگے بڑھا اور کہا:
"لیڈر وہ نہیں ہوتا جو اکیلا کھڑا ہو، بلکہ وہ ہوتا ہے جو اپنی جماعت کے ساتھ مل کر چلتا ہے۔ میری طرح۔"
اتنے میں ہاتھی نے اپنی گونجتی آواز میں کہا:
"قیادت اور بہادری اہم ہیں، مگر یاد رکھو، اصل طاقت دانشمندی میں ہے۔ میں صدیوں کا علم اور تجربہ رکھتا ہوں"!
اسی دوران، پرندے، رینگنے والے جانور، اور پانی کی مخلوقات بھی اس بحث میں شامل ہونے لگے۔ بات بڑھتی گئی، ہر جانور اپنے فضائل بیان کرتا، اور ساتھ ہی دوسرے جانوروں کی خامیوں کی نشاندہی کرتا۔
یہ دیکھ کر جنگل کے سب سے بوڑھے اور دانا جانور، الو، نے اپنی سرگوشی جیسی آواز میں کہا:
"اگر واقعی سب سے بہترین جانور کا تعین کرنا ہے، تو کیوں نہ ہر ایک اپنی خصوصیات خود بیان کرے، اور دوسرے اس کی خامیوں کی نشاندہی کریں؟ پھر معلوم ہوگا کہ کون سب سے برتر ہے۔"
یہ تجویز سب کو پسند آئی۔ اور یوں، جانوروں کی طویل تقاریر اور ایک عجیب وغریب فیصلے کا آغاز ہوا۔
میدان کے عین وسط میں ایک بلند و بالا تخت رکھا گیا تھا، جس پر جنگل کا سب سے قدیم اور غیر جانبدار بادشاہ براجمان تھا۔ اس کے سامنے ایک وسیع کھلا میدان تھا، جہاں تمام جانور جمع تھے۔ فیصلہ طے پایا کہ ہر جانور اپنی خوبیاں خود بیان کرے گا، اور جیسے ہی وہ اپنی فضیلت کا ذکر کرے گا، دوسرے فوراً اس کی خامیوں کی نشاندہی کریں گے۔ بادشاہ ان تمام خوبیوں کو ایک طرف اور خامیوں کو دوسری طرف جمع کرتا جائے گا۔
شیر تخت کے قریب آیا، اپنی گردن بلند کی، اور بلند آواز میں بولا:
"میں جنگل کا بادشاہ ہوں! میری بہادری، طاقت، اور قیادت کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ میں اپنے علاقے کا محافظ ہوں، میں دشمنوں کو للکارتا ہوں، میں شکار میں سب سے آگے ہوں۔ میری ایک دھاڑ ہی سب کو خوف میں مبتلا کر دیتی

ہے۔"

ابھی اس کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ دوسرے جانوروں نے اس پر آوازیں کسنی شروع کر دیں:

بھیڑیا ہنسا: "بہادری؟ تمہارے پاس طاقت ہے، مگر تم تنہا کچھ نہیں کر سکتے! طاقتور تو میں بھی ہوں، مگر میری اصل خوبی میری جماعت ہے"!

ہاتھی نے سر جھٹکا: "قیادت؟ یہ کیسی قیادت ہے کہ تم دوسروں پر ظلم کرتے ہو، اپنے غصے میں کسی کو بھی چیر پھاڑ سکتے ہو"!

ہرن بولا: "تم صرف اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے دوسروں کو دباتے ہو۔ یہ لیڈرشپ نہیں، یہ غرور ہے"!

شیر نے غصے میں ان کی طرف دیکھا، مگر بادشاہ نے اس کی خوبیوں کو الگ رکھا اور خامیوں کو دوسری طرف ڈال دیا۔

ہاتھی دھیرے دھیرے آگے بڑھا اور گہری آواز میں بولا:

"میں جنگل کا سب سے دانشمند اور یادداشت میں سب سے مضبوط ہوں۔ میں نے نسلوں کا علم محفوظ رکھا ہے، میں اپنے خاندان کا وفادار ہوں، اور اپنے ساتھیوں کی بھرپور مدد کرتا ہوں۔ میرا دل نرم ہے اور میں دوسروں کا دکھ سمجھتا ہوں۔"

مگر دوسرے جانوروں نے جلدی سے اس کی کمزوریاں بیان کر دیں:

شیر نے طنزیہ کہا: "دانشور ہو، مگر بعض اوقات اتنے ضدی ہو جاتے ہو کہ دوسروں کی بات ہی نہیں سنتے"!

سانپ نے سرسراہٹ کی: "تم اپنے غصے میں آکر پورے درخت جڑ سے اکھاڑ سکتے ہو، پھر یہ رحم کہاں گیا؟"

عقاب نے بلند آواز میں کہا: "یادداشت میں بہترین ہو، مگر اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ تم بدلے کے جذبات رکھتے ہو اور کبھی کبھار کسی بات کو بھول نہیں پاتے"!

بادشاہ نے پھر خوبیوں کو ایک طرف اور خامیوں کو دوسری طرف ڈال دیا۔

بھیڑیا فخریہ انداز میں بولا:

"میں جنگل میں سب سے زیادہ ٹیم ورک میں مہارت رکھتا ہوں! میں اپنی جماعت کے ساتھ رہتا ہوں، نظم وضبط کا قائل ہوں، اور میری وفاداری بے مثال ہے۔ میں مشکلات میں بھی اپنی ٹیم کا ساتھ نہیں چھوڑتا"!

مگر دوسرے جانور اس پر بھی تنقید کرنے میں پیچھے نہ رہے:

کتا ہنسا: "وفاداری کی بات کرتے ہو؟ لیکن اگر کوئی اور طاقتور آ جائے، تو تم موقع پرست بن کر اپنی جماعت بھی بدل سکتے ہو"!

ہرن بولا: " تمہاری اجتماعی سوچ کبھی کبھی تمہیں اندھی تقلید میں لے آتی ہے، تم خود سوچنے کے بجائے اپنے سردار کے حکم پر چلتے ہو"!

بادشاہ نے حسبِ دستور اس کی خوبیوں اور خامیوں کو الگ الگ رکھ دیا۔

عقاب نے اپنی بلند نظری پر فخر کرتے ہوئے کہا:

" میں سب سے زیادہ اونچا دیکھتا ہوں، سب سے زیادہ مرتکز ہوں، اور میری پرواز کی بلندی کوئی نہیں چھو سکتا! میں ایک سچا شکاری ہوں، جو صرف بہترین کو چنتا ہے"!

مگر دوسرے جانوروں نے فوراً ردعمل دیا:

الو نے گہری سانس لی: " اونچائی پر رہنے سے کیا حاصل؟ تم تنہا ہو، کسی کے ساتھ نہیں"!

کوا بولا: " فوکس؟ یا پھر ضد؟ تم ہمیشہ اپنی ہی راہ پر چلتے ہو، کسی کو ساتھ لے کر نہیں چل سکتے"!

بادشاہ نے اس کی خوبیوں کو اکٹھا کیا اور ایک طرف ڈال دیا جب کہ خامیوں کو دوسری طرف۔

عقاب کے بعد ایک شان دار گھوڑا آگے بڑھا۔ اس کی چمکدار کھال سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی، اور اس کی بڑی، ذہین آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ اس کی ایال ہوا میں لہرا رہی تھی، اور اس کے مضبوط ٹانگوں میں غیر معمولی قوت دکھائی دے رہی تھی۔

" میری سب سے بڑی خوبی میری رفتار اور استقامت ہے۔ میں تھک کر ہار نہیں مانتا، چاہے کتنی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں۔ میرا دل نرم ہے، مگر میرا جسم طاقتور ہے۔ میں کسی کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور ہمیشہ اپنی لگام تھامے رکھتا ہوں"!

بھیڑ میں سے کسی نے کہا، " مگر تم ہمیشہ ایک گروہ کے محتاج ہوتے ہو! اور جب خوف محسوس کرتے ہو تو بھاگ کھڑے ہوتے ہو۔ تمہاری وفاداری بھی کبھی کبھی بوجھ بن جاتی ہے، کیونکہ تم وہیں رکتے ہو جہاں تمہیں کوئی قابو میں رکھے"!

بادشاہ نے خاموشی سے خوبیوں کو ایک طرف رکھا اور خامیوں کو دوسری طرف۔

اب میدان میں ایک کتا کود کر آیا۔ اس کے چمکدار دانت نمایاں تھے، اور اس کی دم جوش و خروش سے ہل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی، جیسے ہر وقت اپنے مالک کی حفاظت کے لیے تیار ہو۔

" میری سب سے بڑی خوبی میری وفاداری ہے! میں ہمیشہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا رہتا ہوں، ان کی حفاظت کرتا ہوں، اور انہیں کبھی نہیں چھوڑتا۔ میں اپنے ساتھی کے لیے جان بھی دے سکتا ہوں"!

بلی نے زور سے قہقہہ لگایا، "ہاں! مگر تمہاری یہی خوبی تمہیں محتاج بنا دیتی ہے۔ تمہیں ہر وقت اپنے مالک کی ضرورت ہوتی ہے، اور اگر کوئی تم سے زیادہ توجہ حاصل کرے تو تم حسد میں مبتلا ہو جاتے ہو! کیا یہ واقعی طاقت ہے؟"

بادشاہ نے دونوں باتیں سن کر خاموشی سے خوبیوں اور خامیوں کو ان کے متعلقہ ڈھیروں میں ڈال دیا۔

ایک چالاک بلی اپنے مخصوص انداز میں آہستہ آہستہ میدان میں اتری۔ اس کی چمکدار سبز آنکھیں چمک رہی تھیں، اور وہ اپنی نفیس حرکات سے دوسرے جانوروں کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں آزاد ہوں، خود مختار ہوں، اور ہر مشکل میں اپنا راستہ خود تلاش کر سکتی ہوں۔ میں دوسروں پر انحصار نہیں کرتی، میں خود فیصلہ کرتی ہوں کہ کب کہاں جانا ہے"!

الو نے سر جھکا کر کہا، " مگر تم اتنی آزاد ہو کہ تمہیں کسی کی پرواہ ہی نہیں! تم ہمیشہ اپنی مرضی سے کام کرتی ہو، اور جب کسی کو تمہاری ضرورت ہو تو تم غائب ہو جاتی ہو۔ کیا خود غرضی کو آزادی کہا جا سکتا ہے؟"

بادشاہ نے دونوں باتوں کو الگ کر کے ڈھیروں میں رکھ دیا۔

ایک بھاری بھرکم دریائی گھوڑا دلدل سے نکل کر میدان میں آیا۔ اس کا جسم طاقت سے بھرپور تھا، اور اس کی چمکدار جلد پر پانی کے قطرے جھلملاتے نظر آ رہے تھے۔

"میں طاقتور ہوں! میں پانی اور زمین دونوں پر راج کرتا ہوں۔ میری قوت اور میرے دانت کسی کو بھی خوف زدہ کر سکتے ہیں"!

مگر مگرمچھ نے غرانا شروع کیا، " مگر تمہاری یہی طاقت بعض اوقات تباہی مچا دیتی ہے۔ تم اپنی طاقت کا استعمال اکثر غصے میں آ کر کرتے ہو، اور جب تم بپھر جاتے ہو، تو اپنے ہی علاقے کو نقصان پہنچا دیتے ہو"!

بادشاہ نے خوبیوں اور خامیوں کو الگ کر کے رکھ دیا۔

ریچھ اپنی بھرپور جسامت اور طاقت کے ساتھ میدان میں داخل ہوا۔ اس کا قد لمبا، جسم چوڑا، اور آنکھوں میں سنجیدگی تھی۔ اس کے بڑے، تیز پنجے زمین پر نشان چھوڑ رہے تھے، اور وہ اپنے دبدبے سے سب کو متاثر کر رہا تھا۔

"میری سب سے بڑی طاقت میرا ضبط اور میری خود کفالت ہے۔ میں اپنے وسائل پر گزارا کرتا ہوں، ضرورت پڑے تو جنگل کے سب سے خطرناک شکاریوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ میں اپنی طاقت کو بے جا استعمال نہیں کرتا، مگر جب وقت آئے تو میں کسی کو بھی پچھاڑ سکتا ہوں"!

بھیڑیا ہنسا اور کہا، " مگر تم حد سے زیادہ تنہائی پسند ہو، اور تمہاری یہی خود کفالت تمہیں دوسروں سے دور کر دیتی ہے۔ تم اپنی مرضی کے مالک ہو، مگر کبھی کبھار یہ ضد نقصان دہ بھی ہو سکتی ہے "!

بادشاہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ریچھ کی خوبیوں اور خامیوں کو الگ کر کے رکھ دیا۔

اب ایک چالاک اور سیاہ کوّا میدان میں اترا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی، اور وہ کسی نہ کسی سازش میں مگن نظر آ رہا تھا۔

" میں سب سے زیادہ ذہین ہوں! میں ہر مسئلے کا حل نکال سکتا ہوں، میں جو چاہوں حاصل کر سکتا ہوں، اور میں سخت سے سخت حالات میں بھی زندہ رہ سکتا ہوں "!

مگر مور نے گردن اکڑاتے ہوئے کہا، " مگر تمہاری یہ چالاکی کبھی کبھار دھوکہ دہی بن جاتی ہے۔ تم دوسروں کے وسائل چرا کر آگے بڑھتے ہو، موقع پرستی تمہاری فطرت بن چکی ہے، اور تمہارا مکار پن دوسروں کو نقصان پہنچا سکتا ہے "!

بادشاہ نے کوّے کی خوبیوں اور خامیوں کو الگ کر دیا۔

میدان کے قریب ایک مگرمچھ اپنی سخت کھال اور زبردست جبڑوں کے ساتھ پانی سے نکل آیا۔ اس کی آنکھیں سکون سے سب کو دیکھ رہی تھیں، جیسے وہ ہر چیز کو پرکھ رہا ہو۔

" میں انتظار کا بادشاہ ہوں! میں صبر کرتا ہوں، میں اپنے شکار پر اچانک جھپٹتا ہوں، اور جب میں کوئی موقع دیکھوں تو اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہوں "!

ہاتھی نے سر ہلاتے ہوئے کہا، " مگر تم بہت ظالم ہو، تم موقع پرست ہو، اور تم دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ تم میں رحم نہیں، تم صرف اپنا فائدہ دیکھتے ہو "!

بادشاہ نے خاموشی سے مگرمچھ کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی تقسیم کر دیا۔

ایک چمکدار، خوش مزاج دولفن پانی سے اچھل کر میدان میں آئی۔ اس کی حرکتوں میں ایک عجیب مسرت تھی، اور اس کی آنکھوں میں ہمدردی چمک رہی تھی۔

" میں سب سے زیادہ ملنسار اور سمجھدار ہوں! میں دوسروں کے ساتھ خوش رہتی ہوں، میں سب کی مدد کرتی ہوں، اور میں اپنے اردگرد کے ماحول کو بہتر بنانے میں یقین رکھتی ہوں "!

مگر ایک شارک نے تیز آواز میں کہا، " مگر تمہاری ملنساری بعض اوقات بے وقوفی میں بدل جاتی ہے! تم دوسروں کی

بہت زیادہ فکر کرتی ہو، اور بعض اوقات تم اپنی حد سے بڑھ کر دوسروں کی مدد میں مگن ہو جاتی ہو، جس سے تم خود نقصان اٹھاتی ہو"!

بادشاہ نے دولفن کی خصوصیات کو بھی دو الگ حصوں میں رکھ دیا۔

اب سمندر کی ایک اور طاقتور مخلوق، ایک زبردست شارک پانی سے نکل کر سامنے آئی۔ اس کی چمکدار جلد اور خونخوار آنکھیں سب کو گھور رہی تھیں۔

"میں سب سے زیادہ طاقتور ہوں! میں سب سے بڑی مچھلی ہوں، میں اپنا شکار کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتی، میں فیصلہ کرتی ہوں اور میں ہی سب پر راج کرتی ہوں"!

مگر کچھوے نے سر اٹھایا اور بولا، " مگر تم ظالم ہو، تمہیں دوسروں کا کوئی خیال نہیں، تم صرف شکار کرنے میں دلچسپی رکھتی ہو اور تمہاری یہی سخت گیری تمہیں دوسروں سے الگ کر دیتی ہے"!

بادشاہ نے شارک کی طاقت اور اس کی سختی کو دو الگ حصوں میں بانٹ دیا۔

اب ایک مصروف شہد کی مکھی بھنبھناتی ہوئی آئی۔ وہ تیزی سے ادھر ادھر اڑ رہی تھی، اس کے چھوٹے مگر مستعد پروں میں ایک الگ ہی جان تھی۔

"میں سب سے زیادہ محنتی ہوں! میں دن رات کام کرتی ہوں، میں اپنی کالونی کے لیے قربان ہو سکتی ہوں، اور میں دوسروں کے لیے شیریں شہد تیار کرتی ہوں"!

مگر چیونٹی نے سر ہلایا اور بولی، " مگر تم ضرورت سے زیادہ محنت کرتی ہو، بعض اوقات حد سے زیادہ مشقت تمہیں تھکا دیتی ہے، اور اگر تمہیں چھیڑا جائے تو تم بہت جارحانہ ہو جاتی ہو"!

بادشاہ نے مکھی کی خوبیاں اور خامیاں بھی الگ کر دیں۔

اب ایک مکڑی اپنے ریشمی جال سے جھولتی ہوئی نیچے آئی۔ اس کی آٹھ آنکھیں چمک رہی تھیں، اور اس کی حرکات میں چالاکی تھی۔

"میں سب سے زیادہ صبر کرنے والی اور ماہر تخلیق کار ہوں! میں اپنے جال خود بُنتی ہوں، میں شکار کا انتظار کرتی ہوں، اور میں بڑی چالاکی سے زندگی گزارتی ہوں"!

یوں ہر جانور آیا، اپنے فضائل بیان کیے، اور دوسرے جانوروں نے ان پر تنقید کر کے خامیوں کو بے نقاب کیا۔ ہر خوبی

ایک طرف رکھی گئی، اور ہر خامی دوسری طرف۔ یہاں تک کہ پوری زمین پر دو بڑے ڈھیر لگ گئے — ایک خوبیوں کا، دوسرا خامیوں کا۔

تمام جانور حیران تھے کہ دونوں ڈھیر تقریباً برابر تھے۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور تھی، مگر خامیوں سے بھی کوئی مبرّا نہ تھا۔

تبھی، اچانک، ایک عجیب مخلوق نمودار ہوئی...

میدان میں دو بڑے ڈھیر پڑے تھے — ایک خوبیوں کا، دوسرا خامیوں کا۔ جانور ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے، کچھ ندامت محسوس کر رہے تھے، کچھ فخر میں کھڑے تھے، اور کچھ الجھن میں تھے کہ آخر اس کا کیا فیصلہ ہوگا۔

تبھی، ایک تیز اور گہری گرج دار آواز فضا میں گونجی، جیسے کسی غیر معمولی شے نے زمین کو چیر کر باہر قدم رکھا ہو۔ تمام جانور چونک کر اس طرف متوجہ ہوئے۔

سامنے ایک عجیب و غریب مخلوق دو ٹانگوں پر کھڑی تھی۔ اس کا جسم دو مختلف رنگوں میں تقسیم تھا — دائیں جانب کا حصہ چمکدار، سفید، اور بیحد خوبصورت تھا، جبکہ بایاں حصہ بدصورت، تاریک اور مکروہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں عجیب تھیں، دائیں آنکھ روشنی بکھیر رہی تھی، مگر بائیں آنکھ میں ایک پراسرار تاریکی تھی۔ اس کے ہاتھ لمبے، انگلیاں نوکیلی، اور حرکات غیر متوقع تھیں۔

جانور اس کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ کسی نے اس جیسی مخلوق پہلے کبھی نہ دیکھی تھی، اس جیسا جانور کبھی نہ سوچا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا، اور بغیر کسی توقف کے سیدھا بادشاہ کے بنائے ہوئے دو ڈھیروں کی طرف لپکا۔

پہلے اس نے خوبیوں کا ڈھیر اٹھایا اور اپنی چمکدار، خوبصورت دائیں جانب کے جسم میں جذب کر لیا۔ اس کا سفید حصہ مزید چمکدار ہو گیا، جیسے کسی نے اس پر روشنی کی ایک اضافی تہہ چڑھا دی ہو۔

پھر وہ خامیوں کے ڈھیر کی طرف جھکا، اور یکدم انہیں اپنی تاریک بائیں جانب میں جذب کر لیا۔ جیسے ہی وہ خامیوں کو اپنے اندر سمو رہا تھا، اس کے بائیں حصے کی سیاہی مزید گہری ہوتی گئی، جیسے اندھیرا اور گہرا ہوتا جا رہا ہو۔

یہ دیکھ کر جانور حیران رہ گئے۔ کچھ پیچھے ہٹ گئے، کچھ نے خوف سے دم سادھ لیا۔ مگر اس عجیب جانور کے چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ ابھری، جیسے وہ پہلے سے جانتا ہو کہ ایسا ہی ہوگا۔

پھر، بغیر کچھ کہے، وہ اچانک تیز رفتاری سے دوڑنے لگا، اس کی چمک اور تاریکی ایک ساتھ لرز رہی تھی۔ میدان میں

موجود جانور اسے حیرت اور خوف سے دیکھ رہے تھے۔ وہ کہاں جا رہا تھا؟ یہ کون تھا؟ کیوں اس نے تمام خوبیاں اور خامیاں اپنے اندر جذب کر لیں؟

جنگل کی حدوں سے گزرتے ہوئے وہ عجیب جانور غائب ہو گیا۔ اس کی روشنی اور تاریکی ایک ساتھ جھلملا رہی تھی، اور پھر وہ ایک دھند میں تحلیل ہو گیا۔

جانور سکتے میں کھڑے تھے۔ آخر وہ کیا شے تھی؟ اور وہ سب کچھ لے کر کہاں گئی؟

الو نے سرگوشی کی:

"وہ سب کچھ لے گیا... اچھائی بھی، برائی بھی، نیکی بھی بدی بھی، خوبی بھی خامی بھی، روشنی بھی تاریکی بھی! اتنا بڑا اور اتنا طاقت ور پیٹ ہے اس کا! وہ کیا شے تھی!

ہاتھی نے گہری سانس لی اور آسمان کی طرف دیکھا، جیسے کسی بھید کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

شیر نے پہلی بار کسی اور کی طاقت کے آگے خاموشی اختیار کر لی۔

اور تمام جانوروں کے ذہن میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا:

" کیا یہ مخلوق ہی سب سے برتر تھی؟ یا پھر بدتر!

گوگو

گاؤں کی فضا میں ایک عجیب سا سکون بسا ہوا تھا۔ صبح کی کرنیں جب کیچڑ سے بھرے کچے راستوں پر پڑتیں، تو ایسا معلوم ہوتا جیسے سونا بکھر گیا ہو۔ کچے اور پکے گھروں کا امتزاج، آنگن میں رکھے مٹی کے گھڑے، نیم کے گھنے درخت، اور دور کہیں گھنٹیاں بجاتے بیلوں کے ساتھ چلتی بیل گاڑیاں، سب مل کر ایک ایسی تصویر بناتے جو دیکھنے والے کے دل میں گہرائی تک اتر جاتی۔ گاؤں کے بیچوں بیچ ایک بڑا تالاب تھا، جہاں عورتیں مٹکے بھرنے آتیں، بچے ننگے پاؤں پانی میں چھپا کے مارتے، اور بوڑھے بزرگ اس کے کنارے بیٹھ کر دنیا کے اتار چڑھاؤ پر تبصرے کرتے۔

اسی گاؤں کے ایک چھوٹے سے مگر صاف ستھرے مکان میں گوگو نامی عورت اپنی خوشحال ازدواجی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ پُرسکون مزاج اور ہنسی مذاق کی شوقین تھی۔ اس کا شوہر ایک قریبی شہر میں معمولی ملازم تھا، جو ہر شام کام سے واپس آتا تو گوگو خوشی سے اس کا استقبال کرتی۔ ان کے چار بچے تھے۔ سب سے بڑا بیٹا کالج میں پڑھتا تھا، دوسرا ایک قریبی شہر کے اسکول میں، تیسری ایک لڑکی تھی، گاؤں کے اسکول میں زیرِ تعلیم تھی، اور سب سے چھوٹا بیٹا بھی وہیں پڑھتا تھا۔ ان کے گھر میں سادگی تھی مگر سکون بھی تھا۔ گوگو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بہت دھیان دیتی، ان کے اچھے اخلاق پر فخر محسوس کرتی اور ان کے روشن مستقبل کے خواب دیکھتی۔

یہ خاندان عام تھا مگر خوشحال تھا۔ گوگو کے دن بچوں کی تعلیم، گھریلو کام کاج اور شوہر کے ساتھ ہنسی مذاق میں گزر جاتے۔ شام کو جب سب مل کر کھانے کی میز پر بیٹھتے، تو گھر میں قہقہوں کی گونج سنائی دیتی۔ گوگو کا ماننا تھا کہ اصل خوشی دنیا کی چمک دمک میں نہیں، بلکہ ایک محبت بھرے خاندان کے ساتھ جینے میں ہے۔

گوگو اکثر اپنی سہیلی زبیدہ بی بی کے بارے سوچتی رہتی تھی جو بڑے زمین دار کی اکلوتی بیٹی تھی اور وہ بہت بڑی حویلی میں

رہتی تھی۔اس کا باپ ایک ایسا شخص جس کی طاقت اور جائیداد کی وسعت کا چرچا پورے علاقے میں تھا۔اس کے کھیت میلوں تک پھیلے ہوئے تھے،نہریں اس کے باغات کو سیراب کرتی تھیں،اور فصلیں سونے کی مانند لہلہاتی تھیں۔

زمیندار کے دو بیٹے تھے،جو کاروبار میں مشغول تھے۔وہ شہر میں بڑے بڑے دفاتر کے مالک تھے،مگر ان کی اصل پہچان اپنے آبائی دیہات سے جڑی ہوئی تھی۔وہیں ان کی حویلی تھی،جہاں شان وشوکت اور تکلفات کا ایک جہان آباد تھا۔ان کا لباس،ان کے گھوڑے،ان کے نوکر چاکر — سبھی ان کے رتبے اور دبدبے کی گواہی دیتے تھے۔مگر ان کی سب سے نازک،سب سے حسین متاع ان کی بیٹی،زبیدہ بی بی تھی۔

زبیدہ بی بی،جو اس حویلی کی سب سے کم عمر فرد تھی،حسن و جمال کی مجسم تصویر تھی۔اس کے رخساروں پر کلیوں جیسی لطافت،آنکھوں میں جھیلوں کی سی گہرائی،اور مسکراہٹ میں ایسی حلاوت تھی کہ دیکھنے والے بے اختیار پلکیں جھپکنا بھول جاتے۔اس کی پرورش ناز و نعم میں ہوئی تھی،اس کے لیے حویلی میں ایک الگ باغیچہ بنایا گیا تھا جہاں نایاب پھول کھلتے تھے،اور جہاں کی روشوں پر وہ شام کی ٹھنڈی ہواؤں میں سیر کرتی تھی۔

زبیدہ بی بی نے شہر کے ایک بڑے کالج سے تعلیم حاصل کی۔وہاں اس کی ذہانت،خوش گفتاری اور نفاست کی دھوم مچی رہی۔مگر جیسے ہی اس کی تعلیم مکمل ہوئی،وہ واپس اپنی حویلی لوٹ آئی،جیسے ایک مہارانی اپنی سلطنت میں واپس آتی ہے۔اس کی آمد پر حویلی میں جشن کا سماں بندھ گیا۔بڑی بڑی دعوتیں ہوئیں،مہمانوں کی آؤ بھگت میں زمین دار کے نوکر چاکر دن رات مصروف رہے۔

اس حویلی میں صرف زبیدہ بی بی کی زندگی ہی نہیں،بلکہ اس کی دنیا بھی بالکل مختلف تھی۔اس کا لباس سب سے عمدہ،اس کے لیے زیور سب سے قیمتی،اور اس کے آرام کا ہر انتظام سب سے نفیس تھا۔نوکر ہر وقت اس کی خدمت میں حاضر رہتے،اور جو چیز کا نام اس کے لبوں سے نکلتا وہ فوراً حاضر کر دی جاتی۔مگر ان تمام نعمتوں کے باوجود،وہ ایک قیدی سی تھی — ایک ایسی قیدی جس کی زنجیریں سونے کی بنی ہوئی تھیں۔

زمین دار کے دونوں بیٹے اپنے کاروبار میں مصروف تھے،اور زبیدہ بی بی کے لیے سبھی پریشان تھے کہ اس کی شادی کب اور کس سے ہوگی۔مگر یہ پریشانی محض دکھاوے کی تھی۔زبیدہ بی بی کا مقدر،اس کی خوشیوں کا راستہ،سب کچھ اس کے باپ اور بھائیوں کے مفادات کے تابع تھا۔

گوگو باورچی خانے کے دروازے کے قریب رکھی چارپائی پر بیٹھی چاندنی رات کی مدھم روشنی میں اپنے ہاتھ کی چادر

سنوار رہی تھی۔ باورچی خانے کے اندر مٹی کے چولہے پر ہانڈی چڑھی تھی، جس سے ہلکی ہلکی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ قریب ہی ایک بڑی عمر کی نوکرانی، جس کے بالوں میں چاندی اتر چکی تھی، ہنڈیا میں چمچ ہلا رہی تھی۔

گوگو نے مسکراتے ہوئے کہا، "دیکھو تو حسنی، کیسی خوشبو پھیل رہی ہے! آج کا کھانا خاص ہونا چاہیے، آخر سب بچے ایک ساتھ کھانے پر بیٹھیں گے۔"

حسنی نے چمچ چلاتے ہوئے سر ہلایا، "جی بی بی جی، میں نے آپ کے کہنے پر خاص مسالے ڈالے ہیں۔ چھوٹے صاحب کو تو خاص طور پر یہ دال پسند ہے، وہ تو انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔"

گوگو ہنس پڑی، "ہاں، وہ بہت شوق سے کھاتا ہے۔ پر آج میرا دل بڑے صاحب کے لیے زیادہ دھڑک رہا ہے۔ نجانے کالج میں کیا کھاتا ہوگا؟ چھوٹے شہر میں بھی اچھے کھانے کہاں ملتے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں ممتا کی چمک تھی، جیسے کوئی ماں اپنے بیٹے کے ہر لمحے کی خبر رکھنا چاہتی ہو۔

نوکرانی نے ہلکی ہنسی میں کہا، "بی بی جی، بڑے صاحب اب بڑے ہو گئے ہیں، اپنا خیال رکھنا جانتے ہوں گے۔ آپ تو ابھی بھی انہیں چھوٹا بچہ سمجھتی ہیں۔"

گوگو نے مسکراتے ہوئے ایک سرد آہ بھری، "ماں کے لیے تو بیٹا ہمیشہ بچہ ہی رہتا ہے۔ اور تم دیکھنا، جب وہ کھانے پر بیٹھے گا تو ضرور کہے گا، اماں، آج تو کھانے میں وہی پرانی دیسی خوشبو آ رہی ہے۔"

نوکرانی نے اثبات میں سر ہلایا، "اور چھوٹی بی بی؟ وہ آج کل کیا کر رہی ہیں؟ سنا ہے کہ گاؤں کے اسکول میں بڑی چُست رہتی ہیں؟"

گوگو کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا، "ہاں، میری گڑیا بہت ذہین ہے۔ ہر مضمون میں اوّل آتی ہے۔ استاد بھی اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ ابھی کل ہی کہہ رہی تھی کہ اماں، مجھے بھی بڑے بھائی کی طرح شہر پڑھنے جانا ہے۔"

نوکرانی نے چمچ رکھتے ہوئے کہا، "اللہ نصیب اچھے کرے سب بچوں کے۔ آپ کا تو گھر باغ کی طرح ہے بی بی جی۔ ہر پھول اپنی جگہ مہک رہا ہے۔"

گوگو نے مسکرا کر کہا، "ہاں حسنی، اللہ نے مجھے خوشیوں سے نوازا ہے۔ آج سب ایک ساتھ کھانے پر بیٹھیں گے، تو ایسا لگے گا جیسے گھر کے در و دیوار بھی خوش ہیں۔"

رات کے سائے گہرے ہو رہے تھے، مگر گوگو کی آنکھوں میں چمک تھی۔ آج اس کا گھر مکمل تھا، آج اس کے خوابوں کا

آنگن سجائی کے رنگوں سے سجا تھا۔ گوگو کھڑکی میں کھڑے ہوکر زبیدہ بی بی کی حویلی کی طرف دیکھنے لگی۔

دھوپ کی تیز کرنیں محل نما حویلی کے بلند درو دیوار سے ٹکرا کر جیسے پلٹتی تھیں تو صحن میں بچھے قیمتی قالین پر ایک سنہری چمک بکھر جاتی۔ زبیدہ بی بی ایک نفیس دیوان پر بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ عمر اب چالیس کی دہلیز عبور کر چکی تھی، مگر گلابی چہرہ، متناسب نقوش اور سنجیدہ آنکھیں آج بھی ویسی ہی دلکش تھیں جیسے بچپن میں۔

گھر میں ایک عجیب سی خاموشی تھی۔ نوکر چاکر اپنے کاموں میں مصروف تھے، مگر ان کے چہروں پر ایک غیر محسوس اداسی تھی۔ زبیدہ بی بی کے والد، زمیندار صاحب، اپنے بڑے بیٹوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ گفتگو اگرچہ عام سے معاملات پر ہو رہی تھی، مگر اصل معاملہ سب کے ذہنوں میں تھا— زبیدہ بی بی کی شادی!

سالہا سال سے یہ موضوع چل رہا تھا، کبھی کوئی اچھا رشتہ آتا، مگر کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر رد کر دیا جاتا۔ زبیدہ کی ماں، جو اب دنیا میں نہیں رہی تھی، کبھی کبھی دبے لفظوں میں کہہ دیا کرتی، "لڑکی کی بھی قسمت ہوتی ہے، مگر اگر اپنے ہی ہاتھ روک لیں تو قسمت بھی کیا کرے؟" مگر زمیندار صاحب کے چہرے پر ہمیشہ ایک سنجیدہ خاموشی رہتی، جیسے وہ جانتے ہوں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

اندر ہی اندر، زبیدہ نے بھی سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ اس کی شادی اس لیے نہ ہوسکی کہ زمین کی تقسیم نہ ہو۔ دولت، جائیداد، شان و شوکت — یہ سب کچھ ایک لڑکی کی زندگی سے زیادہ اہم تھا۔ اس نے کئی بار باپ اور بھائیوں کے چہروں میں چھپی خود غرضی دیکھی، مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔

اُسی شام، زمیندار صاحب نے زبیدہ کو اپنے پاس بلایا۔ وہ ایک لمحے کو ٹھٹکی، مگر پھر سنبھل کر اندر آئی۔ کمرے میں روشنی مدھم تھی۔ والد کی کرسی کے پیچھے لٹکتے بھاری پردے ہوا میں ہل رہے تھے۔ زمیندار نے اس کی طرف دیکھا، جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں، مگر الفاظ نہ مل رہے ہوں۔

"بیٹھو، زبیدہ۔" ان کی آواز میں غیر معمولی نرمی تھی۔ زبیدہ بی بی آہستہ سے ایک طرف بیٹھ گئی۔

میری بچی آج جو مہمان آئے تھے وہ ---------!

ایک لمحے کے لیے زبیدہ بی بی کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی۔ اس نے اپنے وجود کو ایک پل کے لیے کھو دیا، اور تب اس کا خیال اچانک گوگو کی طرف چلا گیا۔ وہی گوگو، جو اپنے باورچی خانے میں کھڑی، اپنے بچوں کے لیے کھانے کی تیاری کرواتی ہے، جس کا شوہر ایک چھوٹے سے شہر میں ملازم ہے، جو ماں کی حیثیت سے خوش ہے، جو محبت، خلوص

اور اپنائیت کی چھوٹی سی دنیا میں جی رہی ہے۔

وہ کرسی سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ زمیندار صاحب نے ایک بار پھر کچھ کہنا چاہا، مگر زبیدہ بی بی ایک لمحے کو رک کر صرف اتنا بولی:

"میں خوش ہوں، ابا سائیں"!

یہ کہہ کر وہ باہر نکل آئی، جیسے حقیقت کے تمام بوجھ اپنے پیچھے چھوڑ آئی ہو۔ وہ ایک بار پھر اسی باورچی خانے میں جا کھڑی ہوئی اور بچوں کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

کمک سگاں

کسی ملک میں ایک سرسبز وشاداب گاؤں آباد تھا۔کھیتوں کی لہلہاتی فصلیں، مٹی کی مہک سے بوجھل ہوا، اور دور کہیں بیلوں کی گھنٹیوں کی مدھم آواز اس گاؤں کی پہچان تھی۔ یہاں کے لوگ سادہ مگر جفاکش تھے۔ زمین ان کا اوڑھنا تھی، محنت ان کا بچھونا۔صبح کا سورج جب مشرق کے افق پر اپنا سنہری سایہ بکھیرتا، تو کسان ہل سنبھالے اپنے کھیتوں کی جانب روانہ ہو جاتے، اور جب شام ڈھلتی تو دہلیزوں پر بیٹھے بوڑھے بزرگ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے دن بھر کی محنت کا حساب کرتے۔

لیکن اس پرامن منظر کے پس پردہ ایک ان دیکھی کشمکش ہمیشہ سے جاری تھی۔ گاؤں میں دو نمبردار خاندان نسلوں سے حکمرانی کر رہے تھے۔ دونوں خاندان زمینداری کے بل بوتے پر طاقتور تھے اور زمین کی ملکیت ہی ان کے اختیار کا سرچشمہ تھی۔ایک طرف "چوہدری خاندان" تھا، جس کے آباؤ اجداد نے برطانوی دور میں سرکار سے وفاداری نبھائی اور یوں وسیع زمینیں ان کے نام لکھ دی گئیں۔ دوسری طرف "ملک خاندان" تھا، جو مقامی روایات اور دیہاتی رشتوں کے سہارے اپنی قوت قائم رکھے ہوئے تھا۔

چوہدری خاندان کے افراد عالیشان حویلی میں رہتے، لمبی چوڑی بیٹھک میں دن بھر مہمان داری ہوتی۔کھانے کے تھال لگتے، اور علاقے کے لوگ اپنے مسائل لے کر آتے۔انصاف وہی تھا جو چوہدری صاحب کہہ دیتے۔ دوسری طرف ملک خاندان کی بیٹھک کسی قلعے سے کم نہ تھی، جہاں ملک صاحب کی دھاک ایسی تھی کہ لوگ ان کے حکم کو حرفِ آخر مانتے۔

دونوں خاندانوں میں بظاہر امن تھا، مگر درحقیقت ایک سرد جنگ برسوں سے جاری تھی۔ چوہدری خاندان چاہتا تھا کہ گاؤں کے سب فیصلے اس کے ہاتھ میں رہیں، جبکہ ملک خاندان اپنی دھاک بٹھانے کے لیے ہر موقع کی تاک میں رہتا۔ ایک کی شادی میں دوسرا گروہ شریک نہ ہوتا، اگر ایک خاندان کسی راستے پر کنواں کھدواتا تو دوسرا اپنے حامیوں کے لیے دوسرا کنواں تعمیر کروا دیتا۔ ایک کا مجمع دیکھ کر دوسرا زیادہ لوگ اکٹھے کر لیتا، اور یوں طاقت کا یہ کھیل خاموشی سے چلتا رہتا۔

عام گاؤں والے ان جھگڑوں سے بے نیاز اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ کھیتوں میں بیل ہل چلا رہے تھے، چکیوں پر دانے پس رہے تھے، گاؤں کی عورتیں گھاٹ پر پانی بھرنے جاتی تھیں اور راستے میں ہنسی مذاق کرتی تھیں۔ بوڑھے برگد کے نیچے چوپالیں جمی رہتیں جہاں حقے کی گڑگڑاہٹ اور پرانے قصے فضا میں گھلتے رہتے۔ لگتا تھا کہ زندگی اپنے قدیم اصولوں پر قائم ہے، جیسے یہ دنیا ہمیشہ سے ایسی ہی تھی اور ہمیشہ ایسی ہی رہے گی۔

مگر گاؤں کی اس پرسکون زندگی میں ایک نیا طوفان آنے والا تھا۔ ایک نیا گروہ ابھرنے والا تھا، جو پرانے نظام کو ہلا کر رکھ دینے کی حکمتِ عملی تیار کر رہا تھا۔

گاؤں کی زمین پرانی حکمرانوں کے قدموں سے مانوس تھی، مگر وقت کا دھارا ایک نئے رخ پر مڑنے والا تھا۔ سرد جنگ کے دو فریق ابھی اپنی پرانی حکمتِ عملیوں میں مصروف تھے کہ ایک تیسرا گروہ خاموشی سے منظرِ عام پر آنے لگا۔ یہ گروہ کسی زمینداری وراثت کا حامل نہ تھا، نہ ہی اس کے پاس وسیع زمینیں تھیں اور نہ کوئی تاریخی بیٹھک۔ مگر اس کے افراد چالاک تھے، زمانے کے بدلتے رنگوں کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے، اور پرانی حکمتِ عملیوں کی بجائے نئی تدبیریں آزمانے کے قائل تھے۔

یہ تیسرا گروہ نہایت خاموشی سے گاؤں میں اپنی جگہ بنانے لگا۔ پہلے پہل وہ دونوں نمبردار خاندانوں کے قریب ہوا، ان کی مجلسوں میں شامل ہونے لگا، ان کی محفلوں میں بیٹھنے کی اجازت حاصل کر لی۔ یوں وہ حکمرانوں کی اندرونی کمزوریوں اور چالوں سے واقف ہونے لگے۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے گاؤں کے عام لوگوں میں اپنا اثر و رسوخ جمانا شروع کر دیا۔ وہی لوگ جو نمبرداروں کے در پر انصاف کے لیے حاضر ہوتے تھے، اب اس نئے گروہ کی باتوں میں آنے لگے۔ لیکن ان کی اصل چال ابھی باقی تھی — ایک ایسی چال جو دونوں نمبردار خاندانوں کے اقتدار کو زمین بوس کر سکتی تھی۔

تیسرے گروہ نے گاؤں کے آوارہ کتوں پر نظر رکھی۔ یہ وہ کتے تھے جو گلیوں میں گھومتے، کھیتوں کے کناروں پر بھٹکتے، اور رات کے وقت گاؤں کے دروازوں پر آ کر بھونکتے رہتے۔ ان کا کوئی مالک نہ تھا، ان کی کوئی سمت نہ تھی۔ تیسرا گروہ سمجھ گیا کہ اگر یہ کتے کسی کے اشارے پر بھونکنے لگیں، تو ان کا خوف لوگوں کے دلوں میں گھر کر سکتا ہے۔

یہ گروہ ان کتوں کو دانہ ڈالنے لگا، انہیں بچا کھچا گوشت کھلانے لگا، ان کے سوتے جسموں کے قریب جا کر ہلکی سی سیٹی بجانے لگا۔ چند ہی دنوں میں یہ کتے ان کے تابع ہونے لگے۔ اب ایک اشارے پر بھونکنے لگتے، ایک چابک پر غرّانے لگتے۔

پہلا وار چوہدری خاندان پر کیا گیا۔ ایک رات جب گاؤں نیند میں ڈوبا ہوا تھا، کتوں کا ایک جھنڈ چوہدری حویلی کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ پہلے ایک نے بھونکنا شروع کیا، پھر دوسرا، اور پھر یوں لگا جیسے پوری زمین غراتی ہوئی جاگ اٹھی ہو۔ لوگ گھروں سے نکل آئے، مگر کتوں کی ہمت بڑھ چکی تھی۔ حویلی کے در و دیوار خوف سے لرزنے لگے۔ چوہدری صاحب کے کارندے لالٹینیں لے کر باہر آئے، مگر کتے نہ ہٹے۔

اگلی رات یہی تماشا ملک خاندان کے دروازے پر دہرایا گیا۔ گاؤں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ "یہ کتے آخر بھونک کیوں رہے ہیں؟ یہ صرف نمبرداروں کے گھروں کا رخ کیوں کرتے ہیں؟" لوگوں کے ذہنوں میں سوال ابھرنے لگے۔ تیسرا گروہ پس پردہ مسکرا رہا تھا۔

یہ وار صرف خوف پھیلانے کے لیے نہ تھا، بلکہ ایک گہری سازش کا حصہ تھا۔ کتے صرف بھونکتے نہیں تھے، بلکہ راستوں میں گھوم کر زور زور سے غرّانے لگتے۔ اگر کسی گلی میں چوہدری خاندان کا کوئی فرد نظر آتا تو کتے وہاں اکٹھے ہو کر بھونکنے لگتے، گویا انہیں دیکھ کر مشتعل ہو گئے ہوں۔ ملک خاندان کے افراد کا گزر ہوتا تو یہی حال ہوتا۔ رفتہ رفتہ پورے گاؤں میں ایک تاثر پھیلنے لگا کہ شاید یہ دونوں نمبردار خاندان کسی گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں، شاید ان کا وقت اب ختم ہونے والا ہے۔

یہاں تک کہ جب کوئی نمبردار مجلس میں بیٹھتا، لوگ سرگوشیوں میں کہتے، "وہ دیکھو، وہی ہے جس کے دروازے پر کتے بھونک رہے تھے۔" یوں طاقت کا سکہ جو نسلوں سے قائم تھا، اب دھیرے دھیرے کمزور ہونے لگا۔

مگر یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ جو کتے آج دوسروں کے دروازوں پر بھونک رہے تھے، کل انہی ہاتھوں پر غرانے لگنے والے تھے جو انہیں سدھانے والے تھے۔

گاؤں کے نمبردار جو کل تک اپنی طاقت کے نشے میں مست تھے، اب انہی گلیوں میں دبے پاؤں چلنے لگے جہاں پہلے ان کی آواز گونجا کرتی تھی۔ وہ جو کل تک پنچایتوں میں اونچی مسندوں پر براجمان ہوتے تھے، اب اپنی حویلیوں تک محدود ہو چکے تھے۔ وجہ وہی تھی — وہی آوارہ کتے جو دن بدن زیادہ جارح ہوتے جا رہے تھے۔

چوہدری خاندان نے پہلے پہل اس تماشے کو محض ایک اتفاق سمجھا۔ مگر جب یہ اتفاق ہر شب ہونے لگا، جب ان کے آدمی بازار جاتے اور کتے ان کے پیچھے بھونکنے لگتے، جب کھیتوں میں ان کی موجودگی پر بھی کتوں کا جھنڈ غراتا، تو چوہدری صاحب کو احساس ہوا کہ معاملہ سنگین ہے۔

ملک خاندان کا حال بھی مختلف نہ تھا۔ ان کے آدمی جب حویلی سے باہر نکلتے، تو دور کھڑے چرواہے ایک دوسرے کو کہنیاں مار کر کہتے، "دیکھو، وہ جا رہا ہے، جس کے دروازے پر کل رات کتے بھونک رہے تھے"! اور یوں چوری چھپے قہقہے بلند ہوتے۔

بدنامی کا خوف طاقت کے زوال کا پہلا زینہ تھا۔ رفتہ رفتہ دونوں خاندانوں نے اپنی سرگرمیاں کم کر دیں۔ پنچایتوں میں شرکت کم ہو گئی، مجمعوں میں جانا محال ہو گیا۔ وہ جو کل تک گاؤں کے فیصلے صادر کرتے تھے، آج اپنے دروازوں کے پیچھے دبک کر بیٹھ گئے۔ ان کے قدم جہاں پڑتے، وہاں صرف کتوں کی غرّاہٹ سنائی دیتی۔

اب تیسرا گروہ اپنی جیت پر مسرور تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میدان خالی ہو چکا ہے، کہ نمبرداروں کی پسپائی ان کی فتح ہے۔ مگر وہ بھول گئے تھے کہ اقتدار کا کھیل ہمیشہ یکطرفہ نہیں ہوتا۔

ایک رات، جب سرد ہوا گاؤں کے درختوں کی شاخوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی، انہی کتوں نے اچانک ایک نئی روش اختیار کر لی۔ جن ہاتھوں نے انہیں دانہ دیا تھا، وہی ہاتھ ان کے لیے غیر مانوس ہونے لگے۔ جن آقاؤں نے انہیں سدھایا تھا، ان کے خلاف ہی غرّانے لگے۔

یہ عمل کیسے شروع ہوا؟ شاید کسی کتے نے کھانے کے لیے مزید مانگا ہوگا، اور جب ہاتھ رکا ہوگا تو اس نے غصے سے بھونک دیا ہوگا۔ یا شاید کسی کتے نے اس گروہ میں سے کسی ایک پر اپنی فطرت کے تحت حملہ کر دیا ہوگا، اور باقی نے اسے دیکھ کر تقلید کی ہوگی۔ جو بھی وجہ ہو، نتیجہ یہ نکلا کہ اب وہی سدھائے ہوئے کتے، جو دوسروں کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کیے گئے تھے، اپنے مالکوں کے خلاف کھڑے ہو گئے۔

اب جب بھی تیسرا گروہ کسی محفل میں بیٹھتا، کتے وہاں پہنچ کر ویسے ہی بھونکنے لگتے جیسے وہ پہلے نمبرداروں کے خلاف

بھونکتے تھے۔ پہلے پہل تو اس گروہ نے انہیں چمکارنے کی کوشش کی، مگر جلد ہی وہ سمجھ گئے کہ کھیل ان کے قابو سے باہر ہو چکا ہے۔

اب نمبرداروں کی طرح یہ تیسرا گروہ بھی خوفزدہ ہونے لگا۔ وہ جو کل تک گاؤں کی گلیوں میں اکڑ کر چلتے تھے، اب سائے میں چھپنے لگے۔ وہ جو کل تک لوگوں میں نمبرداروں کے خلاف باتیں کرتے تھے، اب خود لوگوں کے درمیان جانے سے گریزاں تھے۔

کتے اب ہر طرف تھے—چوراہوں میں، بازاروں میں، مسجد کے باہر، کنویں کے قریب۔ وہ جن کے اشارے پر دوسروں کو بدنام کرتے تھے، اب خود انہی کے تعاقب میں تھے۔

وقت کے ساتھ ساتھ گاؤں کی فضا مزید عجیب ہوتی گئی۔ پہلے جو کتے حکم پر بھونکنے کے عادی تھے، اب وہ قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ پہلے وہ نمبرداروں کے پیچھے لگے تھے، پھر اپنے ہی آقاؤں کو نشانہ بنانے لگے، اور اب یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی کے تابع نہیں رہے۔

گاؤں کی گلیوں میں اب ایک نیا منظر دیکھنے کو ملتا۔ جب کوئی کتا بھونکتا تو دوسرے بھی اس کا ساتھ دیتے، مگر اب وہ کسی ایک ہدف پر متفق نہ تھے۔ کچھ کتے بازار میں کسی دکاندار پر غرّا رہے ہوتے، کچھ چوراہے پر کھڑے کسی کسان کے پیچھے لگے ہوتے، اور کچھ یوں ہی ایک دوسرے کو گھور رہے ہوتے جیسے وہ دشمن ہوں۔

تیسرے گروہ کے افراد، جو کبھی اپنے سدھائے ہوئے کتوں کو فخر سے دیکھتے تھے، اب خود ان سے بچنے کے لیے راستے بدلنے لگے۔ پہلے اگر کوئی کتا ان کے قریب آ کر غرّاتا تو وہ اسے اپنی پرانی مہربانی یاد دلا کر بہلا لیتے، مگر اب کتوں کو ان پر بھی رحم نہیں آتا تھا۔ وہ کھانے کے لیے آپس میں لڑنے لگے، وہ راستوں پر چلنے والوں کو کاٹنے دوڑتے، وہ ہر اس شخص کے پیچھے پڑ جاتے جو ذرا بھی خوفزدہ دکھائی دیتا۔

آخرکار وہ لمحہ بھی آ گیا جس کی کوئی توقع نہیں کر رہا تھا۔ کتوں کے مختلف جھنڈ، جو پہلے ایک ساتھ چلتے تھے، اب ایک دوسرے کے دشمن بن چکے تھے۔

ایک شام، جب سورج پگھلتے ہوئے افق میں گم ہو رہا تھا، چوراہے پر چند کتے گوشت کے ایک ٹکڑے پر لڑ پڑے۔ پہلے تو وہ غرّائے، پھر ایک نے دوسرے کو کاٹ لیا۔ اچانک چاروں طرف چیخوں اور جھنجھناہٹ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ کتے ایک دوسرے پر جھپٹنے لگے، پنجے چلنے لگے، خون کے چھینٹے اڑنے لگے۔ جو کل تک ساتھ شکار کرتے تھے، آج ایک

دوسرے کو چیر نے پھاڑ نے پر تلے ہوئے تھے۔

یہ لڑائی صرف ایک رات کا قصہ نہ تھی۔ اگلے دن گاؤں کے ہر گوشے میں کتوں کے گروہ آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ کنویں کے کنارے، مسجد کے صحن میں، منڈی کے قریب — جہاں دیکھو وہاں غراتے اور کاٹتے ہوئے کتے۔

جب میں نے آخری دفعہ اس بستی کو دیکھا تو وہ کتے ابھی تک ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔

بدلہ

پہاڑوں کے دامن میں بسی وہ بستی صدیوں سے اپنے سادہ طرزِ زندگی میں مگن تھی۔ یہاں کے لوگ زمین کے ساتھ جیتے اور آسمان کی وسعتوں میں اپنے خواب بُنتے۔ انہی میں سے ایک شخص، حاجی رسول بخش، اپنی عمر کی سات دہائیاں گزار چکا تھا۔ وہ لمبے قد کا مضبوط جسم والا آدمی تھا، مگر وقت نے اس کی کمر کو کچھ جھکا دیا تھا، اور پیشانی کی شکنیں زندگی کے نشیب و فراز کی گواہ تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی سختی تھی، جیسے زمانے نے انہیں پتھر میں تراش دیا ہو، اور مزاج بھی کچھ ایسا ہی تھا— تلخ، سخت، اور کبھی کبھی درشت۔ مگر اس درشتی کے پیچھے ایک ایسا دل تھا جو محبت سے خالی نہیں تھا، بس محبت کا اظہار کچھ مختلف انداز میں کرتا تھا۔

اس کا بیٹا، غلام حسن، جوان، فرمانبردار، اور باپ کے آگے ہمیشہ سر جھکائے رکھنے والا تھا۔ وہ اپنے والد سے محبت کرتا تھا، مگر اس محبت میں ایک ہلکا سا خوف بھی شامل تھا۔ بچپن میں باپ کی سختی نے اس کے دل میں ایک ایسا ادب پیدا کر دیا تھا جو کبھی کبھی دہشت کے قریب جا پہنچتا تھا۔ مگر اب، جب وہ اپنی جوانی میں قدم رکھ چکا تھا، تو اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ باپ کی سختی کے پیچھے ایک خاموش سی محبت چھپی ہوئی تھی، ایک ایسی محبت جو لفظوں میں نہیں بلکہ رویوں میں نظر آتی ہے۔

رسول بخش کے لیے دنیا کی سب سے بڑی سچائی روایت تھی۔ وہ انہی رسم و رواج پر چلتا تھا جو اس کے باپ دادا سے چلے آ رہے تھے۔ صبح کی اذان کے ساتھ جاگنا، کھیتوں میں پسینہ بہانا، اور رات کو حقہ گڑگڑاتے ہوئے دن بھر کے قصے دہرانا، یہی اس کی زندگی تھی۔ غلام حسن بھی اسی روایت کا حصہ تھا، مگر اس کے دل میں کہیں نہ کہیں ایک نرم گوشہ تھا، جو چاہتا تھا کہ شاید کبھی باپ کا ہاتھ اس کے سر پر نرمی سے پھرے، شاید کبھی وہ اسے "بیٹا" کہہ کر بلا لے، بغیر کسی حکم، بغیر

کسی سختی کے۔

ایک دن، جب رسول بخش شام کے وقت مسجد کے صحن میں بیٹھا تھا، اس نے اچانک کہا، "حسن، ایک بات سوچ رہا ہوں۔"

"جی ابا؟" غلام حسن نے ادب سے پوچھا۔

"بہت سال ہو گئے ہیں، دربار پر حاضری نہیں دی۔ دل چاہتا ہے کہ وہاں جا کر فاتحہ پڑھوں۔"

یہ سن کر غلام حسن کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ وہ جانتا تھا کہ والد صاحب کا مزاج ایسا نہیں کہ وہ خواہ مخواہ کسی جگہ جانے کی خواہش کریں۔ دربار جانا واقعی ان کے دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی ایک تمنا تھی۔

"جی ابا، ضرور چلیں گے۔"

رسول بخش نے سر ہلایا اور گویا حکم دے دیا، "کل علی الصبح نکلیں گے۔ قافلے کے ساتھ جانا بہتر ہے، ورنہ راستہ لمبا اور دشوار ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور گھر کی طرف بڑھ گیا۔ غلام حسن دروازے کے پاس کھڑا دیر تک باپ کو دیکھتا رہا۔ وہ خوش تھا کہ وہ اپنے والد کے ساتھ ایک ایسا سفر کرے گا جو محض جسمانی نہیں، بلکہ روحانی بھی ہوگا۔ مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ سفر صرف زیارت کا نہیں، بلکہ ایک اور آزمائش کا سفر ہوگا—ایک ایسا سفر جس میں محبت، بوجھ، اور صبر سب کچھ آزمایا جائے گا۔

صبح کا وقت تھا، جب پہاڑوں کے اوپر ہلکی ہلکی کرنیں پھیل رہی تھیں اور فضا میں ایک سکون تھا جو دل کو راحت دیتا تھا۔ غلام حسن اور اس کا والد رسول بخش، دونوں نے سفر کی تیاری مکمل کی اور قافلے کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔ قافلہ بہت بڑا تھا؛ مختلف گاڑیاں، گدھے، گھوڑے، اور پیدل چلنے والے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہوئے دربار کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں مختلف گاؤں اور چھوٹے شہر آ رہے تھے، اور ہر گاؤں کے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر قافلے کا استقبال کرتے، دعائیں دیتے اور کچھ لوگ خشک میٹھے کھانے پیش کرتے۔

دربار پہنچنے پر ایک عجیب سا سکون چھا گیا۔ یہاں کا ماحول بہت مختلف تھا؛ سناٹا اور تقدس کا احساس جیسے انسان کے اندر اتر رہا تھا۔ دربار کا وسیع احاطہ تھا جس کے اندر ایک خوبصورت مسجد اور ایک بلند منارہ تھا۔ دربار کے اردگرد ایک سیلابی جھیل سی بنی ہوئی تھی، جس کے پانی میں آسمان کے رنگ جھلک رہے تھے۔ لوگوں کا ہجوم تھا، مگر ایک خاص سکون اور

احترام کا سا سماں تھا۔ وہ لوگ جو وہاں آئے ہوئے تھے، ان کی آنکھوں میں ایک غمگین سی چمک تھی، جیسے کوئی اندر کی بات کر رہا ہو، کوئی درد تھا جسے وہ اپنے دل میں دبا کر اس تقدس کے مقام پر لائے ہوں۔

رسول بخش اور غلام حسن آہستہ آہستہ دربار کے اندر داخل ہوئے۔ وہاں کچھ بزرگ درگاہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، جنہوں نے ایک طویل وقت تک وہاں رہ کر اپنی دعاؤں کو سچ کر لیا تھا۔ لوگ وہاں آ کر فاتحہ پڑھتے، ہاتھ اٹھا کر دعائیں کرتے، اور کچھ لوگ درگاہ کے دروازے کے باہر بیٹھ کر وقت گزارتے۔

دربار میں ایک خاص قسم کی فضا تھی، جیسے ہر شخص اپنے اندر کی دنیا سے بات کر رہا ہو، جیسے ان سب کی دعائیں ایک دوسرے میں ضم ہو کر فضا میں تیر رہی ہوں۔ یہاں لوگ آنے سے پہلے اپنی مشکلات، اپنے دکھ، اور اپنی محبتیں تقدس کے دروازے پر چھوڑ دیتے تھے۔ ایک طرف کچھ لوگ غمگین تھے، دوسری طرف کچھ کی آنکھوں میں امید کی کرن تھی۔ یہ ایک ایسا مقام تھا جہاں صرف جسم کا سفر نہیں، روح کا بھی سفر تھا۔

رسول بخش اور غلام حسن نے وہاں کچھ وقت گزارا، اور جب وہ باہر نکلے، تو فضا میں ایک خاص سکون تھا، جیسے ایک بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ رسول بخش کی آنکھوں میں ایک عجیب سا سکون تھا، جیسے وہ کچھ پا چکے ہوں، اور غلام حسن کا دل اس سکون میں ڈوبا ہوا تھا۔ دونوں واپس قافلے کی طرف جانے لگے، مگر غلام حسن کے دل میں ایک عجیب سا سوال اٹھا — یہ سکون، یہ تقدس، یہ سب کچھ جو انھوں نے محسوس کیا تھا، کیا یہ صرف اس دربار تک محدود تھا؟ یا پھر ان کے ساتھ، ہمیشہ کے لیے رہنے والا تھا؟

جس قافلے کے ساتھ وہ یہاں آئے تھے وہ ان کی واپس روانہ ہو چکا تھا۔ یہ باپ بیٹا تذبذب میں ہی رہ گئے۔ اب انہیں اکیلے ہی سفر کرنا تھا۔ اب دونوں ہی ایک دوسرے کا ساتھ تھے، اور سڑک پر قدموں کی آواز کے سوا کوئی اور آواز نہیں تھی۔ پورا علاقہ سنسان تھا، اور درختوں کی شاخیں خاموشی سے ہوا میں لرز رہی تھیں۔

غلام حسن نے اپنے والد سے کہا، "ابا، قافلہ ہمیں پیچھے چھوڑ آیا ہے۔"

رسول بخش نے اپنی نگاہوں سے اُسے دیکھا اور بغیر کسی جواب کے، چلتے رہے۔ ان کی رفتار کچھ سست ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے غلام حسن نے محسوس کیا کہ شاید اس کے والد کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ وہ بہت سست قدموں سے چل رہے تھے، جیسے تھک چکے ہوں۔

"ابا، آپ کو کیا ہوا؟" غلام حسن نے تشویش سے پوچھا۔

رسول بخش نے سر جھٹک کر جواب دیا، "بس تھوڑا تھکا ہوں، کچھ نہیں۔" لیکن ان کی آواز میں وہ قوت نہیں تھی جو ہمیشہ ہوتی تھی۔ غلام حسن نے دیکھا کہ اس کا والد ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے، اور اس کے قدموں میں کچھ لڑکھڑاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔

غلام حسن کا دل اچانک ایک غمگین احساس سے بھر گیا، مگر وہ کچھ نہیں بولا۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنے والد کو سہارا دیا اور کہا، "ابا، آپ تھوڑا آرام کر لیں، میں آپ کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیتا ہوں۔"

رسول بخش نے اس کی طرف دیکھا، اور پھر کچھ سوچ کر سر ہلا دیا۔ "ہاں، مجھے کچھ آرام کی ضرورت ہے۔"

رسول بخش ایک درخت کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ شاید تھکاوٹ کی وجہ سے غنودگی چھا رہی تھی اور وہ کچھ دیر سستانا چاہتا تھا۔ حسن چاہتا تھا کہ وہ اپنا سفر جاری رکھیں۔ جب حسن نے محسوس کیا کہ ابا تو اٹھنے کو تیار نہیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ ابا کو کندھوں پر اٹھا لیا جائے تا کہ سفر جاری رکھا جا سکے۔

غلام حسن نے اپنے والد کو اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا، اور دونوں کا سفر جاری رہا۔ اس دوران غلام حسن کی زبان بے اختیار چلنے لگی، جیسے دل میں بھری ہوئی باتیں باہر آنا چاہ رہی ہوں۔

"ابا، آپ ہمیشہ مجھے بتاتے تھے کہ زندگی میں بہت کچھ ہے، بہت کچھ سیکھنا ہے، مگر کبھی آپ نے نہیں بتایا کہ انسان کی سب سے بڑی طاقت کیا ہوتی ہے؟ شاید وہ محبت ہو، جس کی نہ کوئی توقع ہو، نہ کوئی حساب۔ آپ نے ہمیشہ محبت کی بات کی تھی، مگر کبھی اپنی محبت کو ظاہر نہیں کیا۔ اب، ابا، یہ میں ہوں جو آپ کا بوجھ اُٹھا رہا ہوں، وہی بوجھ جس کا آپ ہمیشہ ذکر کرتے تھے۔"

غلام حسن کے دل میں ایک عجیب سی گھٹن پیدا ہو رہی تھی، جیسے اس کے اندر کا کوئی درد پھیل رہا ہو۔ وہ کہتا چلا گیا، "ابا، آپ جب مجھے بچپن میں ڈانٹتے تھے، میں سمجھتا تھا کہ آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ آپ کے ہر لفظ میں ایک خوف چھپتا تھا، اور وہ خوف مجھے کبھی نہ ختم ہونے والی ڈھال کی طرح لگتا تھا۔ پھر بھی، آپ نے ہمیشہ مجھے اپنے طریقے سے محبت دی، ہمیشہ میری رہنمائی کی، اور جب میں آپ کے قدموں میں بیٹھا ہوتا، تو وہ محبت میرے دل میں بچھائی ہوئی سیلاب کی طرح بہہ جاتی۔"

بیٹے کی یہ باتیں ایک عجیب سے سکوت میں بدل گئیں۔ وہ اپنے والد کو اُٹھائے ہوئے تھا، اور ہر قدم میں وہ محسوس کرتا جا رہا تھا کہ کچھ بدل چکا ہے، کچھ ایسا جس کا وہ ابھی تک سمجھ نہیں سکا تھا۔ اس کے اندر کا درد اور محبت، ایک ساتھ اُبھرتے جا

رہے تھے۔ وہ اپنے والد کو اُٹھائے ہوئے تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ اس بوجھ کو اُٹھانے کا کوئی بدلہ نہیں تھا۔

"ابا، میں تھک چکا ہوں۔ یہ بوجھ اتنا بھاری ہے کہ میں اسے مزید نہیں اُٹھا سکتا۔ آپ جب تک کچھ نہیں کہتے، تب تک یہ بوجھ اور بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے۔" غلام حسن کا دل تکلیف سے بھرا تھا، اور پھر بھی وہ اپنے والد کو اُٹھائے ہوئے تھا۔

اسی دوران، ایک عجیب سا احساس پیدا ہوا، جیسے کسی نے اس کے اندر کی ہمت چیلنج کی ہو۔ وہ اپنے والد کی خاموشی پر غصہ نہیں، بلکہ ایک عجیب سی محبت محسوس کر رہا تھا۔

"ابا، آپ مجھے کبھی کچھ نہیں بتاتے۔ جب میں بچہ تھا، تو آپ کے تیز الفاظ مجھے خوف میں مبتلا کر دیتے تھے، مگر اب، اب میں وہی الفاظ خود بول رہا ہوں، آپ کے ساتھ۔ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ ایسا وقت آئے گا، جب میں آپ کا بوجھ اُٹھا کر آپ کے سامنے بیٹھوں گا۔"

غلام حسن اور اس کا والد، رسول بخش، ایک طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد بالآخر اپنے گاؤں کے قریب پہنچے۔ جسمانی طور پر بے حد تھکاوٹ اور ذہنی طور پر بے چینی نے غلام حسن کو گرفت میں لے لیا تھا۔ جب تک وہ دونوں راستے میں تھے، غلام حسن نے خود کو اپنے والد کے بوجھ کو اُٹھانے کے لیے مکمل طور پر وقف کر رکھا تھا، مگر اس لمحے تک آتے آتے، وہ تقریباً ہمت ہار چکا تھا۔

گاؤں کا منظر، درختوں کا سایا، کھیتوں میں کام کرتے کسان، سب کچھ دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ اُس کے اندر کی تھکاوٹ اور پیاس کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ قدم اُٹھاتے ہوئے اس نے ایک اور آخری کوشش کی، اپنے والد کو اور زیادہ بہتر طریقے سے سہارا دینے کی، مگر جسم اب اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس کی نظریں دھندلا گئی تھیں اور قدموں میں لڑکھڑاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنے والد کی حالت پر نظر ڈالی، لیکن وہ پھر بھی خاموش تھا۔

"ابا، ہم بس تھوڑی دور اور چلتے ہیں، پھر گھر پہنچ جائیں گے۔" غلام حسن نے جیسے اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

وہ آگے بڑھتے گئے، لیکن اس کی نظریں اب اپنے والد کی حالت پر مرکوز تھیں۔ وہ ان کے جسم کو تھامے ہوئے تھا، لیکن اُس کی قوتیں جواب دے رہی تھیں۔ ایک طویل خاموشی میں وہ چلتے گئے، اور آخر کار گاؤں کے قریب پہنچتے ہی غلام حسن نے اپنے والد کو کندھوں سے اتار کر کمر پر لا دلیا۔

گاؤں کے لوگ جو کھیتوں میں کام کر رہے تھے، اس منظر کو دیکھ کر دوڑتے ہوئے آگے آئے۔ غلام حسن کا جسم نہ صرف تھکا ہوا تھا، بلکہ وہ پیاس اور بھوک سے نڈھال ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ماضی کی تمام باتیں، تمام یادیں، اور اس

کے دل کی بے چینی جڑ پکڑ چکی تھی۔

گھر کے قریب پہنچ کر اس نے گلی سے باہر ایک چارپائی پر اباپ کو لٹا دیا، چارپائی کے قریب ہی ایک بوری پر لیٹا اور گہری نیند میں ڈوب گیا یا پھر یہ بے ہوشی تھی۔

ایک بزرگ لاش کا جائزہ لے رہا تھا۔سانپ کے زہر کی وجہ سے مرا ہے رسول بخش۔لگتا ہے آٹھ پہر سے زیادہ ہو گئے ہیں مرے ہوئے،اور ہمت ہے حسن کی کہ اتنی دیر باپ کی لاش کو اٹھائے چلتا رہا۔

برداشت

وسطی پنجاب کا ایک ویران سا گاؤں، جہاں وقت سورج کے طلوع وغروب سے ناپا جاتا تھا اور فاصلے بیل گاڑی کے پہیوں سے ماپے جاتے تھے۔ یہاں نہ ریلوے کی سیٹی سنائی دیتی، نہ فضا میں کارخانوں کا دھواں تیرتا۔ یہ وہ گاؤں تھا جہاں رات کی تاریکی کو چاندنی کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور دن کی روشنی کو لو کی دھمکیوں سے نبھانا پڑتا تھا۔

کھیتوں کے کنارے پر، نیم، بیری کی خوش بو کے پاس، پیپل کے سایے میں، ایک کچا پکا سا گھر تھا۔ گھر کی دیواریں مٹی سے لپی ہوئی تھیں اور چھتیں بانس اور کھپریل سے بنی ہوئی۔ اس گھر میں ایک خاندان آباد تھا— حاجی کریم بخش، ان کی بیوی بی بی رشیدہ، اور تین بچے: الیاس، صغریٰ، اور خادم حسین۔

الیاس سب سے بڑا، گیارہ برس کا، سنجیدہ مزاج، کتابوں سے رغبت رکھنے والا۔ صغریٰ درمیانی، نو برس کی، متجسس، سوالات سے بھرپور، اور کبھی کبھار ضدی۔ خادم سب سے چھوٹا، پانچ برس کا، ماں کی گود سے چپکا، ہر وقت کسی نہ کسی خواب میں کھویا ہوا۔

بی بی رشیدہ گھر کی رُوح تھی، جس کے ہاتھ سے بنی روٹی کی خوشبو گھر کو عبادت گاہ بنا دیتی۔ حاجی کریم بخش، اپنی دھیمی آواز اور نرم لہجے میں ایک سایہ دار درخت کی مانند تھے، جو گرمیوں کی دوپہروں میں بھی ٹھنڈک دیتے۔ ان کے چہرے پر وقت کی جھرّیوں نے اپنے دستخط ثبت کیے تھے، لیکن آنکھوں میں آج بھی جوانی کا عکس موجود تھا۔

گاؤں کی زندگی اپنی سادگی میں بھی بے حد پیچیدہ تھی۔ اذان کی صدا کے ساتھ دن جاگتا، اور مرغ کی بانگ پر رات سوتی۔ بچوں کے کھیل کنچیں، کبڈی، اور مٹی کے ڈھیر تھے، جبکہ بڑوں کی مصروفیت کھیت، بیل اور فصل۔

حاجی صاحب اکثر شام کے وقت بچوں کو گھر کے صحن میں بٹھا کر کہانیاں سنایا کرتے۔ وہ قصے جن میں جن، پریاں، دیو اور شہزادے ہوتے، مگر ان میں کہیں نہ کہیں زندگی کا سچ بھی چھپا ہوتا۔ وہ ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی نصیحت ڈال دیتے، جیسے شہد کی مکھی پھول میں زہر نہیں بلکہ مٹھاس تلاش کرتی ہے۔

گھر میں محبت تھی، خاموشی تھی، اور ایک طرح کی سادہ سی خوشی تھی — جو نہ بازار سے خریدی جا سکتی تھی، نہ لفظوں میں سمائی جا سکتی تھی۔ بچے زندگی کے مفہوم کو اپنے والدین کی آنکھوں، ماں کی مسکراہٹ، اور باپ کی پیشانی کی شکنوں سے پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔

سردیوں کی ایک گہری رات تھی۔ دسمبر کی ہوا میں وہی کاٹ تھی جو انسان کے رگ و پے میں اتر کر خامشی کو اور بھی سنّاٹا بنا دیتی ہے۔ گھر کا اندرونی کمرہ مٹی کے تیل سے جلنے والی لالٹین سے روشن تھا، مگر روشنی ایسی مدھم جیسے چراغ نے بھی سردی اوڑھ رکھی ہو۔ دیواروں پر سایوں کے دھندلے رقص تھے، اور چھت کی بانسوں میں ہوا کی سرگوشیاں سنی جا سکتی تھیں۔

فرش پر کئی گدّے بچھے تھے، جن پر گہرے لحاف اوڑھے، تینوں بچے اور ان کے ماں باپ دائرے میں بیٹھے تھے۔ بی بی رشیدہ پاس ہی انگیٹھی میں لکڑیاں سلگا رہی تھیں، جس سے ہلکی ہلکی لکڑی کی خوشبو ماحول میں گھل رہی تھی۔ حاجی کریم بخش بچوں کو کوئی پرانی، مگر نئی سی لگنے والی کہانی سنا رہے تھے۔

کہانی میں ایک فقیر تھا، جو شہر بہ شہر بھٹکتا، لوگوں کو خوابوں کی تعبیریں بتاتا، اور آخرکار اپنی ماں کی قبر کے پاس سکون پاتا۔

جب حاجی صاحب نے "قبر" کا لفظ ادا کیا، تو صغریٰ نے لحاف کے اندر سے سر نکالا، آنکھوں میں خوف اور حیرت لیے پوچھا:

"ابا، ماں باپ مر جائیں تو کیا بچے زندہ رہ سکتے ہیں؟"

حاجی صاحب کچھ دیر خاموش رہے۔ کمرے کی فضا میں یکا یک سنجیدگی اتر آئی۔ خادم حسین نے لحاف کے اندر ہی سے بی بی کی آستین تھامی، اور آہستگی سے کہا: "ماں مر جائے تو روٹی کون دے گا؟"

اور باپ مر جائے تو بچوں کو سہارہ کون دے گا؟ بی بی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

الیاس، جو عمر میں بڑا تھا مگر دل میں اب بھی ڈر کا بچہ چھپا تھا، بولا: "مجھے مدرسے کے صابر کا خیال آتا ہے، اس کی ماں مر گئی، وہ ہر نماز کے بعد روتا ہے۔"

ایک لمحے کو ایسا محسوس ہوا جیسے لالٹین کی روشنی بھی پژمردہ ہوگئی ہو۔ بچوں کے چہروں پر ایک ایسا رنگ تھا، جو کھلونے چھن جانے کے بعد آتا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کو گھور رہے تھے جیسے اچانک اُن کی فانی حیثیت کا ادراک ہوا ہو۔

بی بی رشیدہ نے مسکرا کر بچوں کو قریب کیا، اور کہا:

"ماں باپ ایسے درخت ہوتے ہیں جن کی چھاؤں سے ہم دھوپ بھول جاتے ہیں۔ اگر وہ نہ رہیں، تو ساری دنیا چبھنے لگتی ہے۔"

حاجی صاحب نے آہستہ سے کہا:

"مگر بچو، وقت ہر دکھ پر مٹی ڈال دیتا ہے، اور انسان وہ پتھر ہے جو ٹوٹتا تو ہے، مگر چلتا بھی ہے۔"

صغریٰ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خادم اپنی ماں کی گود میں چھپ چکا تھا۔ الیاس چھت کے ایک گوشے کو گھور رہا تھا، جیسے وہاں کوئی سوال لکھا ہو جس کا جواب صرف وقت دے سکتا ہے۔

کمرے میں خامشی اتر آئی۔ لحاف، انگیٹھی، لالٹین، اور ماں باپ کا وجود — یہ سب کسی عارضی پناہ گاہ کی مانند تھے۔

بچے ایک ایسی دنیا کی دہلیز پر کھڑے تھے جہاں موت کا پہلا قدم ان کے تصور میں داخل ہو چکا تھا۔ اسی خوف کے عالم میں نیند نے ان سب کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ سونے سے قبل ان کے ذہنوں میں یہی سوال تھا کہ ماں باپ کی موت کے بعد بچے کیسے زندہ رہ سکتے ہیں، وہ کیسے ماں باپ کی موت برداشت کر لیتے ہیں؟

پھر ایک رات ۔۔۔۔ کمرے میں تینوں بہن بھائی بیٹھے تھے۔ ماں موجود نہیں تھی، باپ چارپائی پر لیٹا تھا۔

تینوں بچے اب خود سفید بالوں والے، جھکے کاندھوں والے، اور جھریوں سے اٹے چہرے والے بوڑھے ہو چکے تھے۔

مگر ان کی آنکھوں میں وہی پرانی حیرت تھی، جو بچپن کی جاڑوں کی راتوں میں موت کے تصور سے جُڑی تھی۔

صغریٰ، اب اماں صغریٰ کہلاتی تھی، اپنی بیٹی کے ہمراہ لاہور سے آئی تھی۔ خادم، جواب ایک ریٹائرڈ افسر تھا، ملتان سے روانہ ہوا تھا۔ الیاس، سب سے بڑا، گاؤں میں ہی رہا، باپ کی زمین سنبھالتا رہا، مگر دل میں ایک عجیب خلا لیے۔

وہ سب چارپائیوں پر بیٹھے باپ کو دیکھ رہے تھے، جواب خامشی کا مجسمہ بن چکے تھے۔ ہوا میں موت کی بو تھی، مگر اس بار وہ بچپن جیسی بھیانک نہ تھی، بلکہ ایک تھکی ہوئی شام کی طرح پرسکون لگ رہی تھی۔

"ابا کی ہڈیاں جیسے خاک ہو چکی ہیں"... خادم نے آہستگی سے کہا۔

"بہت دنوں سے تو بس سانس باقی تھی، زندگی تو شاید امّاں کے بعد ہی رخصت ہوگئی تھی"... الیاس نے کھڑکی کے باہر

دیکھتے ہوئے کہا۔

صغریٰ خاموش رہی۔اس کی نظریں باپ کے چہرے پر تھیں۔وہ چہرہ، جو کبھی کہانیاں سناتا تھا،اب خود ایک کہانی بن چکا تھا۔

"یاد ہے... ایک رات ابا نے کہا تھا کہ انسان پتھر ہے،ٹوٹتا ہے مگر چلتا ہے"... خادم نے دھیرے سے کہا۔

"اور ہم سوچتے تھے،کوئی ماں باپ کے بغیر کیسے جیتا ہے"... الیاس نے مسکرا کر آنکھیں بند کرلیں، جیسے ماضی کی ہلکی ہلکی سی چھاؤں اس پر پڑ رہی ہو۔

"ابا شاید خوش ہوں کہ ہم سب مل کر ان کا آخری وقت بانٹنے آئے"... صغریٰ نے آہستگی سے کہا۔

لالٹین اب بھی جل رہی تھی،مگر اس کی روشنی ماضی کی لالٹین جیسی نہیں تھی۔وقت نے سب کچھ بدل دیا تھا،سوائے موت کی آمد کے۔وہ اب بھی اسی ٹھہراؤ،اسی یقین اور اسی بے آواز چاپ کے ساتھ آتی ہے۔

اور پھر ایک لمحہ آیا... سانسیں تھم گئیں۔کمرے میں خامشی اتر آئی۔کوئی چیخ نہ تھی، نہ آہ، نہ آنسو۔فقط ایک تھکن زدہ سکون، جیسے کسی لمبے سفر کا اختتام ہو۔

ان کے والد کی سانسیں تھم گئیں۔کمرے میں سناٹا تھا،مگر اس سناٹے میں کسی غم یا اداسی کا گزر نہ تھا۔وہ سب، جو کبھی اس لمحے کا خوف رکھتے تھے،اب ایک عجیب سکون میں ڈوبے تھے۔سالوں کی تکلیف،انتظار اور کمزوری اب فنا ہو چکی تھی۔ حاجی کریم بخش کی موت ایک آرام دہ خواب کی مانند تھی، جو ان کے لیے ایک زندگی بھر کے دکھ کا اختتام تھا۔وہ تینوں بچے، جو آج خود بوڑھے ہو چکے تھے،خاموشی سے باپ کے بسترِ مرگ کے گرد بیٹھے،اپنی زندگی کے اس سب سے سچّے لمحے میں شریک تھے اور سوچ رہے تھے کہ بہتر ہوا والد صاحب کی مصیبت کٹ گئی۔

محبت

قصبہ بظاہر چھوٹا سا تھا مگر اندر سے ایک چھوٹے شہر کی سی رونق اور آسائش رکھتا تھا، ایک ایسے گھرانے کا مسکن تھا جو اپنی تہذیب، سلیقے اور محبت بھرے تعلقات کی بنا پر پورے علاقے میں مشہور تھا۔ یہ گھر نہ صرف ظاہری طور پر صاف ستھرا، کشادہ اور قرینے سے سجا ہوا تھا بلکہ اس کے باسیوں کے دل بھی ایسے ہی روشن، مہذب اور باادب تھے۔

گھر کے صدر دروازے سے داخل ہوں تو ایک چھوٹا سا باغیچہ مہمان کو خوش آمدید کہتا، جس میں گلاب کے پھولوں کی خوشبو ہر وقت ایک لطیف سا احساس پیدا کرتی۔ دائیں جانب کشادہ برآمدہ، جس میں دیوار پر ایک بڑی گھڑی، اور ساتھ رکھی ہوئی مسہریاں، جہاں دوپہر کے وقت بزرگ چائے پیتے ہوئے ملک وملت کے مسائل پر گفتگو کرتے۔ بائیں طرف ڈرائنگ روم، جس میں آرام دہ صوفے، دیوار پر خوبصورت تصاویر، اور کتابوں کا ایک گوشہ، جو بتاتا تھا کہ یہ گھر علم سے خالی نہیں۔

گھر کے مکینوں میں سب سے بزرگ شخصیت، حاجی مشتاق احمد، ایک ریٹائرڈ اسکول ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کی باتوں میں تجربے کا رس اور لہجے میں وہی نرمی تھی جو برسوں کی تدریس کے بعد آتی ہے۔ ان کی بیگم، بی بی خورشید، ایک سلیقہ شعار، نرم دل اور ہر وقت مصروف رہنے والی خاتون، جو گھر کو ایسے سنوارتی جیسے کوئی شاعر مصرعہ تراشتا ہے۔

ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا، فرقان، تین سال قبل تعلیم کی غرض سے انگلینڈ گیا تھا اور اب وطن واپس آنے والا تھا۔ چھوٹا بیٹا، ایان، ابھی مقامی کالج میں زیرِ تعلیم تھا، نہایت خوش مزاج اور حاضر جواب نوجوان، جسے سب گھر والے بہت چاہتے تھے۔ ان کی چھوٹی بیٹی، فضہ، میٹرک کی طالبہ، نرم گو، ہنس مکھ اور والدین کی لاڈلی، ہر وقت ماں کے ساتھ

باورچی خانے میں مصروف رہتی یا اپنے پالتو جانور کے ساتھ کھیلتی۔

یہ ایک ایسا گھر تھا جہاں صبح کی پہلی اذان کے ساتھ دن کا آغاز ہوتا، اور رات سونے سے پہلے باجماعت دعا کے بعد اختتام۔ یہاں نہ صرف وقت کی پابندی بلکہ رشتوں کی نزاکت کا بھی بھرپور خیال رکھا جاتا۔ محلے کے لوگ اس گھرانے کو ایک مثال سمجھتے تھے، جہاں تہذیب، دین داری، اور جدید تعلیم کا خوبصورت امتزاج نظر آتا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی احساس ہوتا کہ یہاں صرف دیواریں نہیں، محبتیں بولتی ہیں۔ ہر کمرہ، ہر کونا، اپنی جگہ ایک کہانی سناتا — بچوں کے قہقہے، بڑوں کی گفتگو، ماں کی مصروفیت، باپ کی نصیحت، اور سب سے بڑھ کر ایک ایسا ماحول جو دل کو سکھ دیتا۔

یہی وہ گھر تھا، جہاں عنقریب ایک خوشی کی لہر دوڑنے والی تھی — فرقان کی واپسی کی خوشی، جس کے لیے بی بی خورشید نے خاص اہتمام شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس خوشی کے پیچھے ایک ایسا فیصلہ چھپا ہوا تھا، جو اس گھر کے سب سے معصوم رکن کی تقدیر بدلنے والا تھا۔

اس گھر کا سب سے چہیتا اور لاڈلا فرد — جی ہاں، "فرد" — کوئی انسان نہ تھا بلکہ ایک خوبصورت، دھلے دھلے رنگوں والا، خوش قامت بکرہ تھا، جس کا نام گھر والوں نے شیرو رکھا تھا۔ شیرو صرف ایک پالتو جانور نہ تھا، بلکہ ایک ایسا ساتھی، ایک ایسا رفیق، جو ہر فرد کے دل میں اپنی جگہ بنا چکا تھا۔

شیرو کی آنکھیں کسی معصوم بچے کی مانند چمکتی تھیں۔ اس کی ٹانگوں میں چستی، جسم پر نرم بالوں کا لباس، اور گردن پر بندھی ہوئی گلابی گھنٹی — جیسے وہ کوئی دلہن کی چمکدار چوڑی ہو۔ جب وہ صحن میں دوڑتا، تو گھنٹی کی جھنکار ایک میٹھے ساز کی مانند پورے گھر میں پھیل جاتی۔ اور جب وہ کھڑا ہو کر اپنی گردن جھٹکتا، تو یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی فنکار آئینے کے سامنے خود کو سنوار رہا ہو۔

اس روز ناشتے کی میز پر سب گھر والے موجود تھے۔ چمچوں کی آواز، چائے کی خوشبو، اور پراٹھوں کی مہک کے درمیان ایک خاص بات یہ تھی کہ گھر میں کچھ مہمان بھی موجود تھے — بی بی خورشید کی چھوٹی بہن اور ان کے دو بچے، جو فرقان کی آمد کی خوشی میں چند دن پہلے آ گئے تھے۔

"شیرو نے آج پھر میرے دوپٹے کے پلو سے کھیلنے کی کوشش کی"! فضہ نے ہنستے ہوئے کہا، "میں نے جھڑکا تو منہ پھلا کر بیٹھ گیا، جیسے ناراض بیوی ہو"!

"ہاہاہا! ناراض بیوی تو بس اللہ کی پناہ"! ایان نے قہقہہ لگایا، "کل میں نے اسے اپنے کمرے کے باہر سیب کھاتے دیکھا، آرام سے بیٹھ کر، جیسے شاہی ناشتے سے لطف اندوز ہو رہا ہو"!

بی بی خورشید مسکرا کر بولیں، "شیرو تو ہمارے گھر کا تیسرا بیٹا ہے، اس کا نخرہ بھی کسی شہزادے سے کم نہیں۔ جب میں صحن دھوتی ہوں تو وہ دیوار کے پاس کھڑا ہو کر دیکھتا رہتا ہے، جیسے کوئی بڑا آدمی کسی مزدور کی نگرانی کر رہا ہو۔"

مہمان خاتون نے تعجب سے کہا، "اتنا پالتو بکرہ میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔ کل تو میرے بیٹے کی گود میں بیٹھ گیا تھا، اور اسے زبان سے چاٹنے لگا"!

"چاٹنا تو اس کی محبت کا اظہار ہے"! حاجی مشتاق نے مسکرا کر کہا، "کئی بار جب میں فجر سے واپس آتا ہوں تو وہ دروازے پر میرا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ جیسے پوچھ رہا ہو، نماز قبول ہوئی یا نہیں؟"

ایک لمحے کو سب ہنسے، پھر خاموش ہوئے، اور بی بی خورشید نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا، "عجیب بات ہے، جانور ہوتے ہوئے بھی دل کے اتنے قریب ہو گیا ہے۔۔۔ اس کی موجودگی میں گھر پورا لگتا ہے۔"

شیرو اس دوران صحن میں کھیل رہا تھا، کبھی دم ہلا کر، کبھی دیوار سے سینگ رگڑ کر، کبھی گردن ہلا کر گھنٹی بجاتا۔ بچے کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھتے، اور ہنستے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود کو ان سب کی گفتگو کا محور جانتا ہو، جیسے وہ خوش ہو کہ لوگ اسے یاد کر رہے ہیں۔

یہ ناشتہ، صرف ایک صبح کی گفتگو نہ تھی، بلکہ اس گھرانے کی محبت، نرمی، اور انسانیت کی عکاسی تھی۔ ایک جانور کو بھی وہ درجہ حاصل تھا، جو اکثر انسانوں کو نہیں ملتا۔

اگلے دن۔۔۔۔ صحن میں دھوپ کا سنہرا چمکدار فرش بچھا ہوا تھا۔ فضا میں چائے کی خوشبو، نرگسی کوفتوں کی بھاپ، اور قہقہوں کی نرم گونج پھیلی ہوئی تھی۔ فرقان کی واپسی پر ہر چہرہ مسرور، ہر آنکھ روشن، اور ہر ہاتھ میں نوالہ۔

دسترخوان پر مزے دار کھانے چنے گئے تھے، مگر ان سب میں جو چیز مرکزِ نگاہ بنی ہوئی تھی، وہ مخصوص پلیٹوں میں رکھے گئے بھنے گوشت کے ٹکڑے تھے۔ وہ لال بھورا رنگ، وہ چمکدار چکنائی کی ہلکی تہہ، وہ نرم ریشے — گویا ہر نوالے میں کوئی راز چھپا ہو۔

حاجی مشتاق نے چمچ سے قورمہ نکالا اور نرمی سے کہا،

"یہ گوشت تو جیسے مکھن کی طرح نرم ہے... زبان پر رکھتے ہی گھل گیا۔"

بی بی خورشید نے ہنستے ہوئے کہا،

"میں نے اپنی زندگی میں ایسا مزے دار قورمہ کبھی نہیں چکھا۔ نہ کوئی بو، نہ سختی، نہ زیادتی — ہر چیز اعتدال میں، جیسے کسی فنکار کا شاہکار ہو۔"

فضہ نے نرگسی کوفتے چکھتے ہوئے کہا،

"اندر تک مصالحہ گھسا ہوا ہے، نہ مرچیں جلن دیتی ہیں، نہ نمک کی کمی ہے... جیسے ذائقہ خود گوشت کے اندر سے پھوٹا ہو۔"

ایان نے ہنستے ہوئے چانپوں کو انگلیوں سے تھاما، "بس یہ چانپیں ہی تو ہیں جو ہاتھ دھونے سے پہلے کھائی جاتی ہیں، اور ہاتھ دھونے کے بعد بھی یاد آتی ہیں۔"

مہمان خاتون نے قدرے حیرت سے کہا،

"میری سمجھ سے باہر ہے کہ یہ گوشت ہے یا کوئی خوشبو؟ ہر نوالہ جیسے ایک غزل ہو، ایک قافیہ، ایک ردیف۔"

فرقان خاموش بیٹھا تھا، وہ محض مسکرا رہا تھا۔ اس نے گوشت کا ایک ٹکڑا آہستہ سے چکھا، اور پھر نظریں جھکا لیں۔ شاید ذائقہ کے پیچھے کی کوئی پرانی یاد ابھر آئی تھی۔

چھوٹے بھانجے حسان نے شرارت سے کہا،

"امی! کیا یہ گوشت ہمیں روز مل سکتا ہے؟ میں تو روز ایسا ناشتہ کر سکتا ہوں"!

قہقہے گونجے، چمچوں کی چھنکار ہوئی، اور دستر خوان کی رونق میں اضافہ ہوا۔

گوشت کی تعریف جاری تھی — کبھی کسی نے اس کی خوشبو کو بارش کی مٹی کہا، تو کسی نے اس کی نرمی کو خواب کی پرت سے تشبیہ دی۔ ہر فرد کے لیے وہ ذائقہ ایک نیا تجربہ تھا، جیسے پرانی محبت کو نئی آنکھ سے دیکھا جا رہا ہو۔

باورچی خانے میں شیرو کی کھال کے قریب ہی اس کا کٹا ہوا سر پڑا تھا جس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ہر آنے جانے والے کو حیرانی سے دیکھ رہی تھیں۔

معصوم چہرے

میں ہمیشہ سے چہرہ شناسی کا شوقین رہا ہوں۔ میرے نزدیک انسانی چہرہ صرف اس کی صورت گری نہیں بلکہ اس کے باطن کی کتاب بھی ہے، جسے پڑھنے کے لیے بینائی سے زیادہ بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آنکھوں کی چمک، ہونٹوں کی جنبش، ماتھے کی لکیریں، رخسار کے گڑھے، سبھی کسی نہ کسی کہانی کے خاموش راوی ہوتے ہیں۔ میں نے اس فن کو محض شوقیہ نہیں، بلکہ ایک باقاعدہ مطالعے کے طور پر سیکھا تھا۔

میرے استاد ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ہر شخص کے جسمانی خدوخال میں اس کے کردار کی چھاپ ہوتی ہے۔ کسی کے ماتھے پر تیوریاں اس کی فطری سختی کی مظہر ہوتی ہیں، کسی کی جھکی پلکیں اس کی شرمیلی طبیعت کی عکاس ہوتی ہیں، اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی مخصوص جسمانی علامات دھوکہ دہی، بے وفائی یا چالاکی کا راز کھول دیتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے کسی قدیم کتاب میں پڑھا تھا کہ جن لوگوں کے رخساروں پر قدرتی گڑھے ہوتے ہیں، وہ دلیری اور بذلہ سنجی میں تو کمال رکھتے ہیں، مگر وہی بے وفائی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اسی طرح تیز نقوش اور باریک ہونٹوں والے لوگ عام طور پر بے رحم اور خود غرض ہوتے ہیں۔

یہ علم میرے لیے کسی تفریح سے بڑھ کر ایک یقین تھا۔ میں نے زندگی میں بے شمار مواقع پر اسے آزمایا اور ہمیشہ میرے اندازے درست ثابت ہوئے۔ کسی تقریب میں کسی اجنبی کے چہرے کے نشانات کو دیکھ کر میں اس کی فطرت کا اندازہ لگا لیتا، اور وقت نے بارہا میری بصیرت کی سچائی پر مہر ثبت کی۔ میرے کئی دوست مجھ پر ہنستے، بعض اسے توہم پرستی کہتے، مگر میں جانتا تھا کہ یہ محض قیاس نہیں، بلکہ ایک گہرا مشاہدہ ہے۔

چہرہ شناسی کے ساتھ ساتھ میرا رجحان پرانی کتابوں، نفسیاتی مطالعات اور قدیم فلسفیوں کے نظریات کی طرف بھی تھا۔ ارسطو، ابن خلدون، اور مولانا روم جیسے دانشوروں نے انسانی نفسیات پر جو کچھ لکھا، میں اسے گھنٹوں غور سے پڑھتا اور عملی زندگی میں اس کے شواہد تلاش کرتا۔ مجھے اپنی اس صلاحیت پر مکمل یقین تھا کہ میں کسی بھی اجنبی کے چہرے کو پڑھ کر اس کے کردار کے پوشیدہ گوشوں تک رسائی حاصل کر سکتا ہوں۔

لیکن ایک دن ایسا آیا، جب میرے مشاہدے نے میرے یقین کو متزلزل کر دیا۔

وہ ایک ستمبر کی سہ پہر تھی جب مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں ایک دور افتادہ قصبے کا سفر درپیش ہوا۔ میں نے ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا۔ اسٹیشن پر ہجوم اپنی تمام تر بے ترتیبی کے باوجود ایک ترتیب میں دکھائی دیا۔ چائے فروش بلند آواز میں مسافروں کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے، کسی کونے میں کوئی دیہاتی نان اور قیمہ پکوان میں مصروف تھا، بچے پلیٹ فارم پر ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے، اور ایک طرف قلی سامان ڈھونے کے لیے سواریوں کی تلاش میں کھڑے تھے۔ میں نے ایک بنچ پر بیٹھ کر اردگرد کا مشاہدہ شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی آ گئی اور میں گاڑی میں سوار ہو گیا۔ یہ کوئی جدید سہولتوں سے آراستہ ریل نہ تھی بلکہ دیہات سے گزرنے والی ایک عام مسافر ٹرین تھی، جس کے ڈبے لکڑی کی نشستوں اور مدھم روشنی والے چراغوں اور خراب پنکھوں سے مزین تھے۔ میں نے اپنی نشست سنبھالی اور کھڑکی سے باہر جھانک کر پلیٹ فارم کے مناظر کو ذہن میں محفوظ کرنے لگا۔ دیہاتی مسافر جن کی آنکھوں میں اجنبیت اور اشتیاق کی ملی جلی کیفیت تھی، اپنے چھوٹے بڑے تھیلے سنبھالے مختلف ڈبوں میں سوار ہو رہے تھے۔ کسی کا بستر سر پر تھا، کسی نے بکری کو مضبوطی سے باندھ رکھا تھا، تو کوئی بچے کو سنبھالتے ہوئے سوار ہو رہا تھا۔

ابھی میں انہی نظاروں میں گم تھا کہ اچانک ایک عورت میری نظر کے دائرے میں داخل ہوئی۔ وہ درمیانی عمر کی، سانولی رنگت اور تیز نقوش والی عورت تھی۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکدار تھیں، جیسے ہر چیز کا گہرا مشاہدہ کر رہی ہوں۔ اس کی چال میں ایک عجیب اعتماد اور پھرتی تھی، جیسے وہ اپنے اردگرد کی تمام حرکات و سکنات کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہو۔ اس کی باریک، کمانی دار بھنویں، پتلے ہونٹ اور تیز نقوش میرے ذہن میں فوراً چہرہ شناسی کے ایک پرانے نظریے کو جگا گئے۔ "یہ وہی علامات ہیں جو کسی چالاک، مکار اور دھوکہ باز شخص میں ہوتی ہیں"! میرا ذہن فوراً خبردار ہو گیا۔

وہ عورت بے تکلفی سے میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ میرے جسم میں ایک غیر مرئی سی لہر دوڑ گئی۔ میں نے خود کو سنبھالا، مگر دل ہی دل میں چوکنّا ہو گیا۔ میرے دماغ میں چہرہ شناسی کے اصولوں کے تحت خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے اپنا بیگ مضبوطی سے پکڑ لیا اور اپنی جیبوں پر ایک بار ہاتھ پھیر کر اطمینان کر لیا کہ سب کچھ محفوظ ہے۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" عورت نے پرسکون لہجے میں سوال کیا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، مگر آنکھوں میں ایک نا قابلِ فہم گہرائی تھی۔ میں نے مختصراً جواب دیا اور دوبارہ کھڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا، مگر میرے اندر کا تجسس بیدار ہو چکا تھا۔ کیا واقعی یہ عورت وہی تھی جو میرے مشاہدے اور علم کے مطابق ہونی چاہیے؟ یا کہیں میں غلطی کر رہا تھا؟

عورت کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سی ملائمت تھی، ایسی جس سے خوف کم اور تجسس زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ میں نے بے دلی سے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا، مگر اس کا وجود میرے شعور کے کناروں پر ہلکی سی سرسراہٹ کی طرح محسوس ہوتا رہا۔ چند لمحے خاموشی میں گزرے، اور اس نے ایک دفعہ پھر گفت گو کے در پر دستک دی۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" اس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا، جیسے کوئی مشاق قاری کسی کہانی کا پہلا جملہ پڑھ رہا ہو۔

میں نے مختصراً اپنی منزل کا نام لیا اور سرسری انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی، جیسے میرے محتاط رویے سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔

"اچھا! وہ تو بہت خوبصورت جگہ ہے۔ میں وہاں ایک بار گئی تھی، برسوں پہلے۔ تب وہاں کی مٹی میں عجب مہک تھی، اور لوگ... آہ! وہ لوگ کتنے سادہ تھے"!

میں نے پہلی بار غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں یادوں کی روشنی چمک رہی تھی۔ میں نے کچھ نہ کہا، مگر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"سفر کرنا کیسا لگتا ہے آپ کو؟"

"بس ٹھیک ہی ہے، ضرورت کے تحت کرنا پڑے تو کر لیتے ہیں۔" میں نے رسمی سا جواب دیا۔

"اور اگر شوق کے تحت کیا جائے؟" وہ ہلکے سے مسکرائی۔

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا آپ کو سفر پسند ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت زیادہ۔ میں سمجھتی ہوں کہ سفر انسان کی روح کو وسعت دیتا ہے۔ جب ہم کسی نئی جگہ جاتے ہیں تو درحقیقت ہم نئے خیالات، نئے لوگوں، اور نئے تجربات کو اپنے اندر جگہ دے رہے ہوتے ہیں۔"

مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔

"لیکن ہمیشہ ہر سفر خوشگوار نہیں ہوتا۔ کچھ مسافر لوٹ کر نہیں آتے، کچھ بھٹک جاتے ہیں، اور کچھ راہ میں لٹ جاتے ہیں۔" میں نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا، شاید اسے احساس دلانے کے لیے کہ میں اس کے بارے میں محتاط ہوں۔

وہ ہنس پڑی، مگر اس ہنسی میں کوئی بناوٹ نہ تھی۔

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ کوئی مسافر کسی راہ بھٹکے ہوئے کو راستہ دکھا دے، یا کوئی کسی اجنبی کے لیے عافیت کا ذریعہ بن جائے؟ ہم ہمیشہ بدترین پہلوؤں پر کیوں سوچتے ہیں؟"

مجھے یہ جملہ کچھ عجیب لگا، جیسے وہ مجھے آئینہ دکھا رہی ہو۔

"کیا آپ اکیلے سفر کرتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، زیادہ تر۔ اور لوگ ہمیشہ یہی سوچتے ہیں کہ ایک عورت اگر اکیلی سفر کر رہی ہے تو وہ یا تو بے وقوف ہوگی یا بہت بہادر۔ حالانکہ بعض اوقات یہ محض ضرورت ہوتی ہے، نہ بہادری، نہ حماقت۔"

میں خاموش ہوگیا۔ وہ عورت واقعی گہری سوچ رکھتی تھی۔ اس کی باتوں میں حکمت تھی، اور اس کے الفاظ میں کوئی بناوٹ نہ تھی۔

"آپ کیا کرتی ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"کبھی یہ سوال خود سے بھی کیا ہے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

میں چونک گیا۔

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم سب اپنی شناخت کسی نہ کسی پیشے یا حیثیت سے جوڑ دیتے ہیں، حالانکہ اصل سوال یہ ہونا چاہیے کہ ہم کیا ہیں، نہ کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ لیکن اگر رسمی جواب چاہیے تو میں ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں۔"

اب میں نے پہلی بار اپنے دل میں شرمندگی محسوس کی۔ میں نے اس عورت کو محض اس کے چہرے کی چند علامتوں کے سبب چور، ٹھگ یا دھوکہ باز سمجھ لیا تھا، جبکہ وہ ایک معلّمہ تھی، ایک علم دوست، ایک دانا عورت۔

"اچھا، تو آپ ایک معلّمہ ہیں؟" میں نے کہا۔

"جی، علم کی روشنی پھیلانا ہی سب سے بڑی خدمت ہے۔ اور میں جہاں جاتی ہوں، کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش بھی کرتی ہوں۔ جیسے ابھی، آپ سے۔"

"مجھ سے؟" میں حیران ہوا۔

"ہاں، میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ بہت سوچنے والے آدمی ہیں، لیکن شاید کچھ زیادہ ہی سوچتے ہیں"! وہ ہنسی۔

میں واقعی شرمندہ ہو گیا۔ میں نے اپنی ساری زندگی چہرہ شناسی کے اصولوں پر بھروسہ کیا تھا، اور یہاں ایک جیتی جاگتی مثال میرے سامنے تھی جو میرے سارے نظریے کو رد کر رہی تھی۔

گفتگو نے مجھے اس قدر متاثر کیا تھا کہ میرے اندر کا وہ زعم ٹوٹ چکا تھا، جو میں نے برسوں چہرہ شناسی کے اصولوں پر پال رکھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دنیا کو محض چند جسمانی نشانیوں کے ذریعے پرکھنا محض ایک خام خیالی ہے۔

ٹرین کی رفتار دھیرے دھیرے کم ہونے لگی۔ باہر کھیتوں کا سلسلہ تنگ ہوتا جا رہا تھا اور چھوٹے چھوٹے گاؤں دکھائی دینے لگے تھے۔ گارڈ کا سیٹی بجانا اور کچھ مسافروں کا اٹھ کھڑے ہونا بتا رہا تھا کہ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن قریب آ رہا ہے۔

میرے وجود میں عجب سی راحت تھی۔ سفر کے آغاز میں جس خوف اور بدگمانی کا شکار تھا، وہ اب کہیں تحلیل ہو چکی تھی۔ اس عورت کی باتوں میں جو شیرینی اور دانائی تھی، اس نے میرے اندر کے تمام خدشات دھو دیے تھے۔ میں نے خود کو پرسکون محسوس کیا اور تھکن کے باعث آنکھیں موند لیں۔

ٹرین کی مدھم ہچکولوں نے میرے وجود میں ایک گہری غنودگی بھر دی۔ میں نیند اور بیداری کے درمیان کہیں معلق تھا، جیسے کوئی خواب اور حقیقت کے دھندلکوں میں بھٹک رہا ہو۔

چند لمحے۔۔۔ شاید چند منٹ۔۔۔ شاید کچھ زیادہ۔۔۔

اچانک کسی جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ وہ عورت، جو ابھی کچھ دیر پہلے اپنی دانائی اور شرافت کی باتیں کر رہی تھی۔۔۔ وہ کہیں نہیں تھی!

"وہ کہاں گئی؟" میں نے ساتھ بیٹھے ایک مسافر سے پوچھا، جو شاید ابھی ابھی بیٹھا تھا۔

"کون؟" وہ حیران ہوا۔

"یہاں ایک عورت بیٹھی تھی۔۔۔ لمبے بال، گندمی رنگت، بڑی ذہین گفتگو کر رہی تھی۔۔۔"

مسافر نے لاپرواہی سے کندھے جھٹک دیے۔

"یہ تو کوئی چھوٹا اسٹیشن تھا، شاید وہ وہاں اتر گئی ہو۔"

میرا دل ڈوب گیا۔ میں نے تیزی سے کھڑکی سے باہر جھانکا، مگر اب باہر صرف دھندلے کھیت، درخت اور دھوپ کی زرد چادر تھی۔

وہ جا چکی تھی۔۔۔میرا سفری بیگ اور میری جیب سے بٹوہ بھی غائب تھا۔